صفر سے ایک تک

سائبر سپیس کے مُنشی کی سرگزشت

مرزا اطہر بیگ

Scanned with CamScanner

مرزا اطہر بیگ کا ناول 'صفر سے ایک تک 'سائبر سپیس کے ایک مُنشی کی سرگذشت ہے۔

لیکن سائبر سپیس ہے کیا؟ اس لفظ کی تخلیق کا سہرا فکشن کے لکھاری ولیم گِبسن کے سر ہے جنھوں نے سنہ انیس سو چوراسی میں پہلی بار اس لفظ کو استعمال کیا۔

اُس وقت شاید وہ خود بھی اس لفظ کے دور رس معانی کا اندازہ نہ کر سکے ہوں۔ خود ان کے مطابق سائبر سپیس محض ایک غیر مرئی حقیقت تھی۔

جدید ٹیکنالوجی کا ایک واہمہ جس میں دنیا بھر کے وہ لوگ مبتلا ہیں جو دفتروں، بینکوں اور دکانوں میں بیٹھے حساب کتاب کر رہے ہیں۔ وہ استاد جو بچوں کو حسابی کلیے سکھا رہے ہیں۔ یہ خطوط اور ہندسوں کا ایسا ملغوبہ ہے جس کے پسِ منظر میں اطلاعات و معلومات کا وسیع سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

آج چھبیس برس گزر جانے کے بعد بھی یہ اصطلاح اتنی ہی مبہم اور پیچیدہ ہے جتنی اپنی تخلیق کے وقت تھی۔

کچھ لوگوں کے نزدیک سائبر سپیس محض دنیا میں پھیلے ہوئے کمپیوٹری نظاموں کے رابطے کا نام ہے۔ دیگر کے خیال میں یہ برقی مقناطیسی قوت کا ایسا استعمال ہے جو دنیا بھر کے افراد کو باہمی رابطوں کے قابل بنا دیتا ہے۔

مرزا اطہر بیگ کے ناول کا ہیرو اس سے بھی ایک قدم آگے جاتے ہوئے کہتا ہے کہ سائبر سپیس مکانیت سے ماوراء ہے اور دنیا بھر کے کمپیوٹروں کو یہ ایک ' لامکاں' میں مربوط کرتا ہے۔ اس لا مکاں تک پہنچنے کے لیے آپ کو انٹر نیٹ کے برقی دروازے پر دستک دینی پڑتی ہے اور پھر برقی رو کے مہین نقطے کا اسپ تازی آپ کی ایڑ لگتے ہی انجانی منزلوں کی طرف محوِ پرواز ہو جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

صفر سے ایک تک کا مرکزی کردار زکی ہمیں بتاتا ہے کہ اس لامکاں میں اُس کی دشت نوردی کسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصّہ نہیں تھی بلکہ اُس کے مالک کا بیٹا فیضان جو کہ بظاہر زکی کا دوست بھی تھا، کمپیوٹری علوم میں بالکل پھسڈی تھا۔ لیکن جب اس نے ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کا فیصلہ کیا تو زکی سے درخواست کی کہ وہ متعلقہ موضوع پر اس لا مکاں سے ضروری مواد منگوا دے۔ زکی نے دوستی سے زیادہ چھوٹے مالک کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے اُسے مواد پہنچانا شروع کر دیا۔

کہانی سنہ انیس سو ستر کے آس پاس شروع ہوتی ہے اور ہم خود کو ایک بہت بڑے زمیندار کی حویلی میں پاتے ہیں جہاں اشرافیہ کی اقامت گاہ کے پہلو میں نوکروں کے کواٹر بھی ہیں جن میں صدیوں سے زمینداروں کے خدمت کرنے والے کمّیوں کی موجودہ نسل پروان چڑھ رہی ہے۔

زکی کا باپ پیشے کے لحاظ سے زمینداروں کا منشی ہے۔ یہ اُن کا خاندانی پیشہ رہا ہے اور زمینوں کا سارا حساب کتاب لمبے لمبے بہی کھاتوں میں درج ہے۔زکی پہلی بار یہ سارے کھاتے کمپیوٹر میں منتقل کرتا ہے اور اس کے باپ کو احساس ہوتا ہے کہ حساب کتاب کے صدیوں سے جاری نظام کو بدلنا ممکن ہے اور وہ اس تبدیلی کا پورا کریڈٹ اپنے بیٹے کو دیتا ہے۔

مالک لوگ 'سالار' کہلانے والی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور خاصی الگ تھلگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فیضان سالار مالکوں کی نئی نسل کا نمائندہ ہے اور اپنے منشی کے بیٹے زکی کی مدد سے یونیورسٹی میں ایک سکالر کا مقام حاصل کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

اگر آپ کہانی میں کسی ہیروئن کے متلاشی ہیں تو ایک فرانسیسی طالبہ آپ کی کسی حد تک مدد کر سکتی ہے لیکن زلیخا نامی یہ لڑکی عام معانی میں کہانی کی خاتونِ اوّل نہیں ہے۔ دیکھا جائے تو کوئی کردار بھی اردو فکشن کے روایتی ڈھانچے میں فٹ ہوتا ہوا نظر نہیں آتا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ مصنف نے یہ ناول مابعدِ جدید فکشن کی تکنیک پر تحریر کیا ہے اور اس میں دکھایا ہے کہ پاکستان میں مقتدر طبقے کی زندگی گزشتہ صدی کی آخری تین دہائیوں میں کن تبدیلیوں سے گذر رہی تھی، جب اطلاعاتی ٹیکنالوجی طرح طرح کے روپ دھار کر کمپیوٹر، انٹر نیٹ، ٹیلی ویژن، ٹیلی فون، اور سیل فون میں نصب کیمرے، ریڈیو اور منی ٹی وی کی صورت میں جلوہ گر ہو رہی تھی اور ہمارے نیم جاگیردارانہ سماج کو اٹھا کر اچانک جدید ترین زمانے میں پٹخ دیا گیا تھا۔

ناول کے بہت سے شاخسانے قدیم و جدید کے اسی تضاد سے پھوٹتے ہیں اور غالباً اردو ادب میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس سماجی صورتِ حال کو پوسٹ ماڈرن فکشن نے اپنا موضوع بنایا ہے۔

'میں نے کرسر زلیخا کےنام کی طرف بڑھایا تو عجیب احساس ہوا، جیسے میں اسے چھو رہا ہوں اور نام پر کلِک کرنا کیسا لگا، میں کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ کوئی بھی میری بات پر یقین نہیں کرے گا اور سب یہی کہیں گے کہ کمپیوٹر کا یہ شیدائی بالکل پاگل ہو گیا ہے۔'

مرزا اطہر بیگ کے کردار زمان و مکان کی روایتی بندشوں سے آزاد گویا خود بھی ایک لا مکاں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ مصنف کواحساس ہے کہ آج ہم ایک 'عالمی وقت' میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جہاں فاصلوں کا تصور مٹ چکا ہے۔ مثلاً ہمارے لیے عین ممکن ہے کہ ہم گوجرانوالا میں بیٹھ کر ٹی وی پر کرکٹ کا ایک ایسا میچ دیکھ سکیں جو اُس وقت انگلستان کے شہر نوٹنگھم میں کھیلا جا رہا ہو، اسی دوران ہمیں شکاگو سے ایک دوست کا فون بھی آسکتا ہے اور ہم لندن میں کسی دوست سے انٹرنیٹ پر چیٹنگ بھی کر سکتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

زکی بھی کمپیوٹر کی سکرین پر زلیخا سے چیٹ کر رہا ہے... زلیخا جو اسکی گرل فرینڈ ہے اور اس وقت پیرس میں ہے، لیکن پنجاب کے اس دور افتادہ قصبے بھالیکی میں بیٹھا زکی اپنی توبہ شکن دیہاتی محبوبہ کو بھی دیکھ رہا ہے اور اسکی دعوتِ نگاہ سے بھی نبرد آزما ہے۔ ان خالص انسانی جذبات کے ساتھ ساتھ مشینی ابلاغ بھی جاری ہے اور دونوں کے ادغام سے پیدا ہونے والی انوکھی صورتِ حال ہی مرزا اطہر بیگ کی تحریر کا جوہر ہے۔

شہر کے ماحول میں ایک طرف تو گلی محلّے کے کردار ہیں جو رات کو بند دکانوں کے ویران تھڑے آباد کرتے ہیں اور دوسری جانب شہر کے کلچرل چوہدری ہیں جنھوں نے ملک میں ادب، آرٹ، کلچر، فنون اور تفریحات کی تمام ذمہ داریاں اپنے ناتواں کاندھوں پہ لے رکھی ہیں۔ ناول نگار نے اس گروہ کو کُبا گروپ کا نام دیا ہے اور اسکے بارے میں لکھا ہے کُبا گروپ اعلی طبقات کے ایسے افراد پر مشتمل تھا جس پر اِس جاہل معاشرے کی کلچرل اور انٹلیکچوئل رہنمائی کرنے کا بوجھ اتنی شدت سے آن پڑتا ہے کہ اُن کے کندھے باقاعدہ آگے کو جھک جاتے ہیں۔ حالانکہ خدانخواستہ کمر کے عُضلات میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔ پھر شاید اس جھکاؤ کو بیلنس کرنے کے لیے وہ اپنے چہرے کو تھوڑا سا اوپر اُٹھا لیتے ہیں اور دیکھنے والوں کو مسلسل سونگھنے کی کیفیت میں نظر آتے ہیں...'

ہیرو کا دوست .. یا یوں کہیے کہ مالک کا بیٹا، شہر کی انٹلیکچوئل فضا سے متاثر ہو کر کُبا گروپ میں شامل ہوجاتا ہے۔ لیکن دانش ورانہ گفتگو کےلیے اسے جو مواد درکار ہے وہ زکی ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

'میں سالار منزل پہنچا تو رات کے تین بج رہے تھے اور مجھے تعجب ہوا کہ ڈرائنگ روم میں فیضان سالار 'اکیسویں صدی: توقعات اور خدشات' کے ڈاؤن لوڈز کا پلندہ سامنے رکھے میرا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کُبا موڈ میں ہرگز نہیں تھا بلکہ میری طرف دیکھتے ہوئے اسکا انداز ایک سخت گیر فکر مند چچا کا تھا جسے گاؤں سے اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر آئے ہوئے آوارہ مزاج بھتیجے کو اپنے گھر میں ٹھہرانے کا ناخوشگوار فریضہ سونپ دیا گیا ہو۔'

Scanned with CamScanner

'کہاں سے آرہے ہو تم اس وقت، رات کے تین بجے۔'

'... میں مزے سے ایک جگہ کھڑا پنجوں پہ وزن بدلتا رہا۔ فیضان کے چہرے پر ایک ایسی حیرت ظاہر ہو رہی تھی جو میں نہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، جیسے وہ اصل معاملہ سمجھ گیا ہو...'
کہیں سے پی کر آرہے ہو؟... اگر یہ نشہ نہیں تو پھر کیا ہے... اور وہ ایک لخت کُبا موڈ میں آکر اٹھ کھڑا ہوا اور کندھے جھکا کر علمی تفکّر کا کُب نکال کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔'

فیضان سالار کی طرح ہیرو کا بڑا بھائی پیر صاحب بھی ایک قابلِ توجہ کردار ہے۔ اپنی کارکردگی میں یہ منٹو کے صاحبِ کرامات سے مختلف نہیں لیکن زمانی طور پہ ساٹھ برس بعد تخلیق ہونے والا یہ صاحبِ کرامات اپنے پروٹو ٹائپ سے کئی سطحوں پر آگے نکل گیا ہے۔ مابعدِ جدید فکشن کا ایک کردار ہونے کے ناتے یہ پیر صاحب اپنی جعل سازی کو چھپانے کی بجائے سرِ عام اسکی نمائش کرتے ہیں لیکن یہ صاف گوئی اور کھرا پن ہی اصل میں وہ خطرناک پھندا ہے جس میں وہ انتہائی کامیابی سے من مرضی کی خواتین کو پھانستے ہیں۔

ایڈگرایلن پو کی ڈراؤنی نظموں اور کافکا کی کہانیوں کے چیستانی ماحول کا مِلا جُلا تاثر آپ کو آرے والے ٹال کے مقام پر ملتا ہے جہاں کچھ نادیدہ ہاتھ ناول کے مرکزی کردار کو لا کر حبسِ بے جا میں ڈال دیتے ہیں۔ شدید جسمانی اذیت کے لمحات میں زکی پر انسانی بدن کے کچھ انوکھے راز افشا ہوتے ہیں۔ وہ انسانی جسم میں موجود سوراخوں کو گہری نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان کے بارے میں ایک فلسفیانہ نقطۂ نظر تشکیل دیتا ہے۔ کہانی میں روایتی انداز کی کوئی تعارفی ابتداء، کوئی نقطۂ عروج یا کوئی تسلی بخش انجام موجود نہیں کیونکہ مابعدِ جدید فکشن اِن تکلفات سے ماورا ہوتی ہے اور کہانی میں شروع سے آخرتک مسلسل سانس لیتا ہوا لمحۂ موجود ہی بیانیے کی اصل بنیاد ہے۔ اگر آپ کہانی میں ماضی یا مستقبل کی کوئی جھلک دیکھتے بھی ہیں تو حال کے اسی دھڑکتے پھڑکتے لمحے کی بدولت اور اسی کے توسط سے دیکھتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

اگر آپ دت بھارتی، گلشن نندہ، ابنِ صفی اور اے آر خاتون کے ناول پڑھ کر جوان ہوئے ہیں تو ہو سکتا ہے 'صفر سے ایک تک' آپ کو ایک آنکھ نہ بھائے لیکن فکر کی ضرورت نہیں۔ آپ کے جانے پہچانے اے حمید اور رضیہ بٹ تو مسلسل لکھ ہی رہے ہیں اور نئے لوگوں میں بھی سیما غزل اور عمارہ احمد نے پاپولر فکشن کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

مرزا اطہر بیگ اُردو کی پوسٹ ماڈرن فکشن میں ہراول دستے کے آدمی ہیں۔ ہراول دستہ۔۔جو فتح کے جشن میں خود تو شریک نہیں ہو سکتا لیکن بعد میں آکر کامیابی اور کامرانی کے جھنڈے لہرانے والے انھیں بھرپور خراجِ عقیدت ضرور پیش کرتے ہیں۔

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

(میری قسمت کے ستارے کو اس دنیا میں نہیں بلکہ عدم میں قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ میری شاعری کی شہرت بھی میرے بعد ہوگی، جب میں عدم میں پہنچ جاؤں گا) غالب

یہ ناول سانجھ پبلیکیشنز مفتی بلڈنگ ٹمپل روڈ لاہور نے شائع کیا ہے اور 394 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت 400 روپے مقرر کی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

SIFAR SAY AIK TAK- AN IMPORTANT POST MODERN NOVEL

Prof. Mirza Athar Beg's second novel Sifar Say Aik Tak – The Story of a fine product of post-modern literature like the first one, that is, Ghulam Bagh. The term cyberspace which may be called the grandeur of modern day technology is replete with symbolic dimensions hitherto unknown in other novels. Mirza Athar Beg, profesor of philosophy, has admirably turnd computer's wonders into an efffective fiction. The clerk of cyberspace is Zaki, whose father and fore fathers have been in the servile service of SALARS – the traditional feudals. Faizan, lecturer of history, belongs to Salars! Zaki helps him upload relevant matter how to operate a computer. Faizan is presering Salars' history alongwith Zaki- an unpardonable act. Both are punished for this crime. .Salar's touts wants to recover and destory its CD's

It is evident that computer technology has disturbed the mind and soul of both of them. the end is interesting, yet pathetic one of the interpretations may be that evil .forces of feudals in the days to come

As TIME is a character in AAG KA DARYA, computer .seems to be a character in SIFAR SAY AIK TAK

"غلام باغ " کے بعد مرزا اطہر بیگ نے اس ناول کے ذریعہ ایک جدید طلسمی حیرت کدہ ناول سے محبت کرنے والے قارئین کے سامنے پیش کردیا ہے۔ "غلام باغ" پہلی بار 2006ءاور دوسری بار 2007ء میں چھپا۔ ایک ادبی ناول کا انتہائی کم عرصے میں دو بار چھپ جانا ادب اور ادیب دونوں کے لیے انعام سے کم نہیں اس ناول کا ماجرائی اسٹرکچر

Scanned with CamScanner

کچھ ایسا تھا گویا ایک خاص نوعیت کی ایبسرڈٹی Absurdityماضی سے لے کر اب تک کے زمانی دائروں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔ اسی لیے مجھے یہ خیال آیا کہ "غلام باغ" ناول آف دا ایبسرڈNovel of the Absurd ہے۔ اپنے مضمون میں، میں نے بڑی عاجزی سے مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے:

"تھیٹر آف دا ایبسرڈ کے متعلق ادب سے متعلق لوگ جانتے ہیں کہ یہ ڈرامے کی وہ شکل ہے جس میں محیّر العقول ، نرالی اور عجیب و غریب نیز مضحکہ خیز صورت ہائے احوال کے ذریعے زندگی کے حقائق ، المیوں اور لایعنیت کی عکاسی کی جاتی ہے۔ایک زمانے میں اس تھیٹر نے یوروپ میں اپنا اثبات کرایا تھا۔"١

"غلام باغ" کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس کا ہر کردار ، عمل کے اعتبار سے ایک نوع کا معمّہ نظر آتا ہے تاہم پوسٹ ماڈرن ازم کی حقیقت کے حوالے سے یہ "کہانی پن" کو قائم رکھتے ہوئے ہمارے علاقے کے لوگوں کی، جن میں برصغیر کی نوآبادیات شامل ہیں، فطرت کو تاریخ اور اپنے زمانے کی ان گنت جہات کو پیش کرتے ہیں بشرطیکہ انہیں گہری نظر سے جانچا او ر پرکھا گیا ہو۔ ان میں کبیر مہدی کی ڈائری میں درج جملے ہمارے اس قابل اعتراض ذہنی روّیوں اور سوچوں کی عکاسی کرتے ہیں جن سے اختلاف ناول کے ماجرائی اسٹرکچر کے پیش نظر نہیں کیا جاسکتا۔ مجموعی طور پر یہ مائینڈ سیٹMindset آہستہ آہستہ پوسٹ ماڈرن فکشن کی بنیاد بنتا جارہا ہے اور اگر ہمارے معاشرے کو "باغ" کی علامت سے واضح کیا جائے تو ناول کا عنوان "غلام باغ" اسی مائینڈ سیٹ کی غلامی کے استعارے میں ڈھل جائے گا، کم از کم میرے نزدیک یہ ایک ذاتی تشریح ہے ، واضح رہے کہ ایک علامتی ناول جو پوسٹ ماڈرن ازم کی کوکھ سے جنم لیتا ہے ایک سے زیادہ جمالیاتی تشریح کا حامل ہوتا ہے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس ناول کو ناول آف دا ایبسرڈ کا لبادہ پہناتے ہوئے اسے پوسٹ ماڈرن ناول قرار دینے کا پہلو نظروں سے اوجھل رہا لیکن عارف وقار کے مضمون "ناول صفر سے ایک تک۔ ایک تجزیہ" میں ان کی مندرجہ ذیل رائے نے سوچ کا نیا دریچہ وا کردیا۔ میں اس کا کریڈٹ انھی کو دوں گا اسی لیے "صفر سے ایک تک" پر لکھتے ہوئے میں نے "غلام باغ" کو پوسٹ ماڈرن ازم کے چوکٹے میں نصب کرکے دیکھا اور لطف اندوز ہوا۔ ان کی رائے یہ ہے :

Scanned with CamScanner

نصب کرکے دیکھا اور لطف اندوز ہوا۔ ان کی رائے یہ ہے :
"مصنف نے یہ ناول مابعد جدیدیت(Post Modern)فکشن کی تیکنیک پر تحریر کیا ہے اور اس میں دکھایا ہے کہ پاکستان میں مقتدر طبقے کی زندگی گزشتہ صدی کی آخری تین دہائیوں میں کن تبدیلیوں سے گزررہی تھی۔ جب اطلاعاتی تیکنالوجی طرح طرح کے روپ دھار کر کمپیوٹر، انٹرنیٹ ، ٹیلی ویژن اور سیل فون میں نصب کیمرے، ریڈیو اور منی ٹی وی کی صورت میں جلوہ گر تھی تو اس وقت ہمارے نیم جاگیردارانہ سماج کو اٹھا کر جدید ترین زمانے میں پٹخ دیا گیا۔ ناول کے بہت سے شاخسانے قدیم و جدید کے اسی تضاد سے پھوٹتے ہیں اور غالباً اردو ادب میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس سماجی صورت حال کو پوسٹ ماڈرن فکشن نے اپنا موضوع بنایا۔"۲
عارف وقارنے سماجی صورت حال اور پوسٹ ماڈرن فکشن کے تال میل سے اپنے اس مضمون میں جن سچائیوں کو اپنی تنقیدی نگاہ سے دیکھا وہ قابل تعریف ہے۔ انہوں نے آخیر میں اپنی یہ رائے دی ہے کہ وہ پوسٹ ماڈرن فکشن میں ہر اول دستے کے آدمی ہیں(صفحہ ۳۱) اس کو میں بھی زیرِ بحث لانا چاہوں گا۔ انہوں نے"غلام باغ" کو بھی اسی رائے میں شامل کیا ہے۔ اس پر بھی بحث ضروری ہے۔
بہتر ہو ہم اگر صفر سے ایک تک (سائبراسپیس کے منشی کی سرگزشت) کے ماجرے پر ذرا غور کر لیا جائے۔ سب سے پہلے سائبر اسپیس کو سمجھ لیا جائے۔ اس کی توجیہ عارف وقار نے یہ کی ہے کہ یہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے کمپیوٹر کے نظاموں کے رابطے کا نام ہے۔ دیگر کے خیال میں یہ برقی مقناطیسی قوت کا ایک ایسا استعمال ہے جو دنیا بھر کے افراد کو باہمی رابطوں کے قابل بنادیتا ہے۔ مرزا اظہر بیگ کے ناول کا ہیرو(ذکی) اس سے بھی ایک قدم آگے جاتے ہوئے کہتا ہے کہ سائبر اسپیس مکانیت سے ماورا ہے اور دنیا بھر کے کمپیوٹروں کو ایک لامکاں میں مربوط کرتا ہے ۔ اس لامکاں تک پہنچنے کے لیے آپ کو انٹرنیٹ کے برقی دروازے پر دستک دینا پڑتی ہے اور پھر برقی رَو کے مہین نقطے کا اسپ تازی آپ کی ایڑ لگتے ہی انجانی منزلوں کی جانب محوِ پرواز ہوجاتا ہے...."۳
Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر کے لیے فرض کرلیا جائے کہ سائبر اسپیس مکانیت سے ماورا ہے اور دنیا بھر کے کمپیوٹروں کو ایک لامکاں میں مربوط کردیتا ہے اور اس تک انٹرنیٹ کے ذریعہ پہنچا جاسکتا ہے تو حیات محمد سالار جو موضع کوتل سالاراں کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اپنی خاندانی کتھا کے الم نشرح ہونے سے اس قدر خوفزدہ کیوں ہے؟ لامکاں میں پہنچ کرہر شہ کا فنا ہوجانا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ یہ سالار وہ جاگیردار ہیں جو انسانوں کا خوفناک استحصال کرتے ہیں۔ ذکی کا باپ، عطاءاللہ سالاروں کے پاس منشی تھا۔ عطا اللہ کا باپ اور اس کا باپ سب منشی گیری کرتے تھے ، یعنی غلام تھے، زمینوں، جاگیروں کا حساب کتاب ، کمپیوٹر کی مانند رجسٹروں میں محفوظ رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی حرکتوں کا بھی حساب کتاب وہ محفوظ رکھتے تھے لیکن اپنے ذہن میں اور زبان پر تالے ڈال کررکھتے ہیں۔ زبان کاکھولنا اور ملک الموت کی آمد دونوں برابر تھے لیکن سائبر اسپیس سے منسلک انٹرنیٹ کے لامکاں میں جو کتھا بطور سی ڈیCD محفوظ ہونے کے قریب ہے اس کو سالاروں کے آہنی پنجے 'لامکاں' سے 'مکاں' میں گھسیٹ کر لانے کی صلاحیت رکھتے ہیں! کیا اس پر یقین کیا جاسکتا ہے؟ مرزا اطہر بیگ جو فلسفے کے پروفیسر ہیں اسے سائنسی فتوحات کے آئینے میں فکشنیاتی معجزہ بناتے ہیں۔ یہ ہی پوسٹ ماڈرن فکشن ہے لیکن مرزا اطہر بیگ کا ایک کمال یہ ہے کہ وہ حقیقی دنیا سے واقعات لے کر انہیں کہانی پن کے جوہر سے جوڑ کر پیش کرتے ہیں لہذا ان کے یہاں ماجرا چیستاں نہیں بنتا۔ یہ ہی اسلوبیاتی و تیکنیکی خصوصیت تھی جس نے "غلام باغ" کے دو ایڈیشن 2006ءاور 2007ء چھپوا دیئے جبکہ ایک ہی ایڈیشن کافی عرصے میں فروخت ہوتا ہے۔ اب سنا ہے کہ "غلام باغ" کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہونے والا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اردو فکشن ابہام اور چیستاں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ یہ ضرور ہے کہ ناول کا دانشورانہ انداز مطالبہ کرتا ہے قاری اپنے ذہن پر زور دے اور اس سطح پر پہنچے جہاں اسے مطالعاتی مسرت کا احساس ہو۔ "آگ کا دریا" کے ابتدائی سو سوا سو صفحات میں یہ کیفیت ہے ۔ "غلام باغ" میں بعض صورت ہائے احوال جن کا تعلق کرداروں کی ابوالعجبی، بظاہر احمقانہ و مضحکہ اعمال بباطن ان کی ذہنی و نفسیاتی پیچیدگیاں خاصی دلچسپی کی حامل ہیں اور واقعات کے مختلف ٹکڑوں کو جوڑنے کے بعد جو تصویری خاکہ بنتا ہے وہ ہی ناول کو اسلوبیاتی سطح پر کامیابی کی کسوٹی میں

Scanned with CamScanner

تبدیل کردیتا ہے۔ محمد عاصم بٹ کا ناول "دائرہ" بھی جسے پوسٹ ماڈرن فکشن یا مابعد جدید تحریر کا نام دینا چاہیے اسی کیفیت کا حامل ہے۔ یہ بھی کم و بیش انہی ستونوں پر استوار ہوا ہے۔ گزشتہ دس بارہ سال میں اس نوع کے ناولوں کی تخلیق مابعد جدید میلان کو اعتبار عطا کرتی ہے اس میں محمد حمید شاہد کا "مٹی آدم کھاتی ہے" کا ناول بھی شامل ہے۔

اب ہم پھر "صفر سے ایک تک" یعنی سائبر اسپیس کے منشی کی سرگزشت کی جانب لوٹتے ہیں اور اس کے دو متوازی کردار ذکی اور فیضان سالار کا تذکرہ کرتے ہیں جن کے گرد یہ مکاں اور لامکاں تخلیق ہوا ہے۔ ذکی ہیرو تصور کیا جاسکتا ہے اور سالاروں کا بیٹا فیضان اگر مکمل ہیرو نہیں تو شریک ہیرو(Co-Hero) مانا جاسکتا ہے کہ دونوں متوازی طور پر چلتے نظر آتے ہیں۔ ذکی کے خاندان کے لوگ یعنی باپ، دادا اور پھر ان کے باپ اور دادا سالاروں کے منشی ہیں ۔ اس حقیقت کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ یہ لوگ جاگیرداری اور وڈیرہ شاہی کے خلاف انقلاب لانے یا مخالفت کرنے کا خیال تک ذہن میں نہیں لاسکتے لیکن ذکی کمپیوٹر کی دنیا کا آدمی ہے اور انٹرنیٹ کے ذریعہ مکانیت سے ماورا ہو کر لامکانیت کا کل پرزہ بن چکا ہے! اس نظام سے تمام کمپیوٹر جڑے ہوئے ہیں۔ سی ڈیCDکی تیاری اور اس کا اسکرین پر مظاہرہDisplayزوروں پر ہے۔ اس کاروبار حیات میں زلیخا خلجی بھی منسلک ہے جس کا باپ فرانس میں ہے، اس کی ماں فرانسیسی ہے اور اس کا پاکستانی باپ اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں پاکستان ہی میں رکھوانا چاہتا ہے۔ زلیخا خلجی فیضان اور ذکی کے درمیان پنڈولم کی طرح گھومتی ہے۔ اس کا دانشورانہ نقطہ نظر اس کے ناول میں ہونے کا جواز پیدا کرتا ہے، ورنہ بغیر خاتون کے ناول کی کیا حیثیت ہے۔ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ.... صفر سے ایک تک میں وہ موسم بہار کی علامت ہے، مکاں اور لامکاں کی تفہیم میں سرگرداں۔ ادھر فیضان سالار کو مرزا اطہر بیگ نے ایک ایسے نام نہاد لیکچرار کا روپ دیا ہے جو اپنے مقالے "اکیسویں صدی.... توقعات اور خدشات" کے لیے انٹرنیٹ کے ماہر ذکی سے مدد کا طالب ہے۔ وہ "کُبا گروپKubba Group سے متعلق ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے اپنے لسانی کمالات کا مظاہرہ "غلام باغ" میں قابلِ تعریف انداز میں کیا ہے۔ اسے "صفر سے ایک تک" میں بھی دہرایا ہے۔ یہ کبا گروپ وہ گروپ ہے جو نام نہاد دانشور ہیں،

Scanned with CamScanner

کم فہم ہیں اور پاکستان کے جاہل معاشرے کی رہنمائی کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آن پڑی ہے جس کی بنا پر ان کے کندھے جھک گئے ہیں اس لیے کُبے کہلائے جارہے ہیں! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایسے کُبوں کو مرزا اطہر بیگ نے لاہور میں ضرور دیکھا اور پرکھا ہوگا۔

عمومی طور پر اچھا ناول نگار اپنی زندگی میں دیکھے ہوئے کرداروں کی تصویر کشی کا ماہر ہوتا ہے۔ ”غلام باغ“ کا کبیر مہدی، نیورولوجسٹ زہرہ جس کا باپ مردانہ کمزوری کی دوا بناتا ہے جس کے مراحل کو وہ خاموشی سے دیکھتی رہتی ہے۔ نیز یہ کہ اسمبلیوں کے ممبران، صنعت کاراور دیگر مقتدر و عیاش طبقات اس کی نظر میں رہتے ہیں۔ مرزا اطہر بیگ ان کو طنز میں ملفوف کرکے پیش کرتے ہیں۔ اس دائرے میں اور بھی کردار اپنی موجودگی کا احساس دلا کر ناول کے بصیرت کے پہلو کو واضح کرتے ہیں۔ ”صفر سے ایک تک“ میں طنز کے تحت تخلیق شدہ بہت سے دیہی کردار ہیں جو بظاہر بیانیہ کردار نظر آتے ہیں تاہم اپنے مابعد جدید سسٹم کے تسلسل میں وہ انوکھے اور پہلو دار ہیں۔ مثال کے طور پر ذکی کا بھائی ثنااللہ جو موضع بھاٹی کے میں پیری کرنے لگا تاکہ خوب پیسہ کمائے، لوگوں کو گمراہ کرے۔ اس نے سکّو نامی عورت سے شادی کرلی تھی جس کا شوہر ہیروئن کے زیادہ استعمال کے باعث مر گیا تھا۔ یہ عورت بھی اپنی ذات میں خوب تھی۔ ایک دن ثنا اللہ سوٹ بوٹ میں نظر آیا تاکہ ثقافت کے میدان کا بھی شہسوار بن سکے یعنی ثقافتی طائفوں کومشرق وسطیٰ روانہ کرنا۔ یہ معاملات زیادہ مال بنانے کا شاخسانہ تھے۔ کُبا گروپ کا تعارف تو کرایا جاچکا ہے اسی کے ساتھ ساتھ مرزا اطہر بیگ طنزیہ پیرائے میں وعدہ معاف رائیٹر کا تصور بھی پیش کرتے ہیں۔ وعدہ معاف گواہ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ وہ حقیقی راز کھول کر اصل مجرم کو پکڑوادیتا ہے اور انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوجاتے ہیں۔ یہ وعدہ معاف رائٹر فیضان تھا جس کے مضمون کے چھپنے کے بعد اخبار میں رائٹر کا اصل نام ظاہر کرنے کا مطالبہ زو رپکڑ گیا۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اس لیے کہ اس ناول نگار کے اصل مقصد یعنی مرکزی تھیمThemeکو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

Scanned with CamScanner

"اس کے علاوہ اس قسم کی علمی اور فکری باتیں جو فیضان مجھے(ذکی کو) سمجھانے کی کوشش کرتا تھا(حوالہ آڈیو فائل TSIM-2,3,4) قارئین اپنے خطوط میں کرنے لگے وہ ہی(وعدہ معاف رائٹر، وعدہ معاف استاد، وعدہ معاف فن کار وغیرہ) اور پھر تو ایک ایسا موقع آیا کہ وعدہ معاف دانشوری جیسے کوئی فکری تحریک کی شکل اختیار کررہی ہے۔ اس سے ہر گز یہ نہ سمجھا جائے کہ ہر جانب سے فیضان سالار کی حمایت جاری تھی۔ حمایت سے کہیں بڑھ کر مخالفت شدید تھی اور مخالفین ان تحریروں کو الگ الگ قسم کی دشمنی قرار دے رہے تھے۔ مثلاً کُبا گروپ اسے الف دشمنی کہتا تھا تو فیضان کی یونیورسٹی کا ایک لٹھ بردار طلباءگروپ اسے ب۔ج قسم کی دشمنیاں کہہ کر ان کی بھرپور مذمت کرتا تھا۔"

اب جو شخص پاکستان کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات سے واقفیت رکھتا ہے اسے یہا ںکا پورا منظر سمجھ میں آجائے گاجسے دوسرے انداز سے مرزا اطہر بیگ نے بیان کیا ہے۔ عدم برداشت، مخالفین کو بزور شمشیر ختم کرنے کی کوششیں، قتل وغارت گری اور ٹارگٹ کلنگ وغیرہ۔ یوں بات بہت دور تک جائے گی۔ لیکن ان وعدہ معاف ادیبوں، وعدہ معاف محققین ، وعدہ معاف اساتذہ،وعدہ معاف فن کاروں کی اپنے ساتھیوں کے لیے دی گئی رپورٹیں جو معنی رکھتی ہیں وہ سب پر عیاں ہیں۔ یوں لگتا ہے اس حمام میں دوسروں کو ننگا کرنے کار واج اب عام ہوچکا ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے اسی رجحان کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ سچ بولنا اور سچ لکھنا دونوں زندگی کے (پاکستان کے تناظر میں) خطرناک راستے ہیں۔ اس کی ناول میسبب سے بڑی دو مثالیں انہوں نے ماجرے کا حصہ بنائی ہیں۔ پہلی تو یہ ہے کہ فیضان سالار اپنے کُبا موڈ میں سالاروں کا حصّہ، ہوئے ان کی جاگیردارانہ خباثتوں کو انٹرنیٹ میں اپ لوڈUploadکررہا ہے یعنی بے نقاب کررہا ہے، نتیجے کے طور پر سائبر اسپیس کا کوئی شہاب ثاقب ان کے صدیوں سے چلے آرہے نظام کو نیست و نابود کرسکتا تھا لیکن اس سے پہلے خود فیضان سالار ان قوتوں Forces کی زد میں آگیا جو جاسوس کتوں کی مانند اس کے مخالفین پر نظر رکھ کر اسے خوفناک سزا دیتے ہیں بلکہ صفایا کردیتے ہیں۔ فیضان سالار کو بھی قید و بند کی مشقتیں جھیلنا پڑیں اور کمپیوٹر اور سی ڈیز تک اس کی

Scanned with CamScanner

رسائی کو ناممکن بنادیا گیا۔ دوسری طرف ذکی اور اس کے کنبے کو بھی سزا بھگتنا پڑی۔ ذکی جو اپنی سائبر مکانی پر نازاں رہتا ہے اس لیے کہ وہ Digital Pulse کی گاڑی پر سوار ہو کر کئی منزلیں طے کرنے کا عادی ہوگیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اعمال کے نتائج کوcodifyکرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ ایک بار جب وہ فیضان سالار کے چچا زاد بھائی کی شادی میں جاکر میراثیوں اور بھانڈوںسے بار بار یہ جملہ سنتا ہے کہ ....”سرکار ہم تو آپ کی جوتیوں میں بیٹھنے والے ہیں....“ تو بہت پریشان ہوجاتا ہے کہ ”ان لوگوں کو جوتیوں میں بیٹھنا کیسا لگتا ہوگا! پھر اسے ایک قریب المرگ حسّو نامی میراثی جس نے اس ماحول کے ایسے ایسے رازبتائے کہ ذکی کے چودہ طبق روشن ہوگئے اور اسے پتہ چلا کہ ....”جوتیوں میں بیٹھنے والے جوتیاں پہننے والوں کے بارے میں کچھ ایسی گہری باتیں جانتے تھے جو کوئی دوسرا نہیں جان سکتا اور جو صرف شاید جوتیوں میں بیٹھ کر ہی جانی جاسکتی ہیں۔“۵

یہ استعاراتی عکاسی اپنی ذات میں ہمارے معاشرے میں اس تقسیم کی ان گنت داستانیں سناتی ہے جو محض ایک مخصوص طبقے میں نہیں بلکہ مختلف طبقات میں پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے معاشرے کا ایک مکروہ چہرہ سامنے آتاہے۔ ناول نگار کو اپنے معاشرے کی تصویر کشی کرنا پڑتی ہے یہ اس کا ایک ایسا وظیفہ ہے جس سے تخلیقی طور پر اجتناب برتنا ممکن نہیں۔ ہوسکتا ہے اسے گھسا پٹا جملہ تصور کیا جائے لیکن معاشرے کی تصویر کشی فکشن کے فن کا جزولاینفک ہی قرار پائے گی۔ مرزا اطہر بیگ کا جہاں تک تعلق ہے وہ مابعدجدید اسلوب میں ہمیں بتانا چاہتے ہیں کہ انٹرنیٹ کے ذریعہ سائبراسپیس(خواہ حقیقت ہو کہ واہمہ) کی حکمرانی کے دور میں بھی ہمارا معاشرہ کئی سو سال پہلے کی روایات میں زندہ ہے جہاں ایک ظالم ہے دوسرا مظلوم۔ مظلوم جوتیوں میں بیٹھنے کو تیار اور وہ وہاں سے ایسے حقائق کے انکشاف کا باعث بنتا ہے کہ اس کو ذکی جیسا سائبر اسپیس کا منشی اپ لوڈ کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی اطلاع پر اس کو زبردست سبق سکھایا جاتا ہے۔ ٹارچر سیل کی پٹائی کے نتائج سے دنیا واقف ہے۔ یعنی پوسٹ ٹرامیٹک ڈس آرڈر(Post Traumatic Disorder Stress) کی تکلیف سے علاحدہ گزرنا۔ اس کے گھر میں ڈاکو بھی کودے یعنی اسے ایسی

Scanned with CamScanner

سائبر اسپیس کے منشی کی سرگزشت" کا اختتام دیکھیں:
"زلیخا خلجی جسے برائے نام ناول کا مرکزی خاتون کردار(ہیروئن) کہا جاسکتا ہے اور جو صرف فیضان اور ذکی کے درمیان ایک جمالیاتی پُل کی حیثیت میں زندہ ہے، کہتی ہے:
"ایک بار لاہو دیکھ کر میں پیدا تو ہوچکی ہوں۔ اب دوبارہ دیکھنے پر کیا دوبارہ پیدا ہوں گی؟
ذکی۔"میرا خیال ہے لاہور والوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم دونوں ہی دوبارہ پیدا ہوجائیں۔
زلیخا خلجی۔"بس تم اپنی "الٹی پیدائش سے بچنا۔
ذکی۔"تم بھی.... ڈیجیٹل میجک تو میرے سسٹم پر اثر کرتا ہے۔"٦
واضح رہے کہ ذکی اپنے گاؤں کی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ زلیخا محض دوست ہے جو اس کی ذات کے سائبر اسپیس سے برآمد ہوتی رہتی ہے۔ البتہ فیضان اس سے محبت کرتا نظر آتا ہے مگر وہ بھی واہمہ سا لگتا ہے۔ وہ سالاروں کی تاریخ کے ادھڑ بن میں پھنسا ہوا ہے۔
ذکی کا دکھ یہ ہے کہ دنیا پھر صدمے کی حالت میںآجاتی ہے اور پھر اپنے کام دھندے میں لگ جاتی ہے۔ میرا باپ مجھے دیکھ کر پریشان ہے۔ بڑا بھائی خدا کی برگزیدہ ہستیوں کے مزاروں پر جاتا ہے اور سلامتی کے لیے منتیں مانتا ہے اور وہ سب اسے اپنی دنیا میں واپس لانا چاہتے ہیں، بھالیکے سویا ہوا قصبہ ہے۔ پھر وہ اپنے کمپیوٹر سینٹر کا دروازہ اوپر اٹھاتا ہے اور سنسان رات کے سناٹے میں اس "کھڑکی" کے سامنے آتاہے جو دنیا پر کُھلتی ہے۔ ایک بڑے نیٹ ورک کا ہوم پیج اس کے سامنے ہے۔ اسے نئی پیش رفت کی تلاش ہے۔ وہ سوچتا ہے یہ نئی پیش رفت کیا ہے۔ کیا وہ مکمل خاتمہ ہوسکتی ہے؟ کیا وہ مکمل آغاز ہوسکتی ہے؟؎٧
یہا ں ناول کا اختتام ہے۔ جن قارئین نے یہ ناول پڑھا ہے وہ گواہی دیں گے کہ اس اختتام میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ یہ داستان صفر سے ختم ہو کر ایک پر ختم ہوئی ہے حالاں کہ اس میں صدیوں سے چلاآیا دیہی سماج ہے جس میں ظالم اور مظلوم کی تقسیم ہنوز موجود ہے۔ لیکن شاید ٹیکنالوجی جس نے کمپیوٹر کے ذریعہ سائبر اسپیس کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے، الف سے آگے ب،ت، ث، ج اور اس سے آگے کی داستانیں رقم ہونا باقی ہیں۔ مرزا اطہربیگ نے جس خوب صورتی اور لسانی مہارت سے اپنی کمپیوٹر نالجKnowledgeکو مابعد، جدید فکشن

Scanned with CamScanner

اوپر اٹھاتا ہے اور سنسان رات کے سناٹے میں اس ''کھڑکی'' کے سامنے آتاہے جو دنیا پر کُھلتی ہے۔ ایک بڑے نیٹ ورک کا ہوم پیج اس کے سامنے ہے۔ اسے نئی پیش رفت کی تلاش ہے۔ وہ سوچتا ہے یہ نئی پیش رفت کیا ہے۔ کیا وہ مکمل خاتمہ ہوسکتی ہے؟ کیا وہ مکمل آغاز ہوسکتی ہے؟''

یہا ں ناول کا اختتام ہے۔ جن قارئین نے یہ ناول پڑھا ہے وہ گواہی دیں گے کہ اس اختتام میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ یہ داستان صفر سے ختم ہو کر ایک پر ختم ہوئی ہے حالاں کہ اس میں صدیوں سے چلاآیا دیہی سماج ہے جس میں ظالم اور مظلوم کی تقسیم ہنوز موجود ہے۔ لیکن شاید ٹیکنالوجی جس نے کمپیوٹر کے ذریعہ سائبر اسپیس کو اپنے گھیرے میں لیا ہوا ہے، الف سے آگے ب،ت، ث، ج اور اس سے آگے کی داستانیں رقم ہونا باقی ہیں۔ مرزا اطہربیگ نے جس خوب صورتی اور لسانی مہارت سے اپنی کمپیوٹر نالجKnowledgeکو مابعد، جدید فکشن کا حصہ بنایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس کی مزید جہتوں مثلاً کردار نگاری ، مکالموں اور انٹرنیٹ کی فکشنیاتی تفصیلات کا احاطہ ہونا ابھی باقی ہے۔

حواشی/حوالہ جات:

[1] مضمون ''غلام با'' ناول آف دا ایبسرڈ مشمولہ ''اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار'' ناشر: فکشن ہاؤس 39، بک اسٹریٹ مزنگ روڈ لاہور 2012ء صفحہ 31، واضح رہے کہ اس کا اولین ایڈیشن ماجرا سرائے پبلی کیشنز ، کراچی سے 2008ء میں شائع ہوا تھا۔ حوالہ ص:32

[2] مضمون: صفر سے ایک تک۔ ایک تجزیہ۔ مشمولہ ''قومی زبان'' شمارہ ماہ دسمبر 2010ء صفحہ 11، مضمون نگار پاکستان میں بی بی سی اردو سے وابستہ ہیں۔

[3] ایضاً©۔ صفحہ 10

[4] ایضاً©۔ صفحہ167

[5] ایضاً©۔ صفحہ51

[6] ایضاً©۔ صفحہ 389

[7] ایضاً©۔ صفحہ392-393

Scanned with CamScanner

اکیسویں صدی کے اہم اردو ناول اور فکری میلانات

محمد فاروق بیگ

ABSTRACT:

It is 21st Century. Urdu novel is in its renaissance period which is a part of its evolution. Urdu novel reinstated after a short period of hibernation. A number of Urdu novels has been written in Pakistan and India after the year 2000 AD. Urdu novel of 21st century Introduced a new style, approach, technique, structure and characters.

اردو ناول زندہ ہے تیزی سے بنتے ہوئے عالمی گائوں میں ہر زبان اور اس کے ادب کی اہمیت دو چند ہوتی جارہی ہےجو زبان اور ادب اپنے فروغ اور تخلیقات میں زندہ ہے اس کا مستقبل بھی روشن ہے۔اسی لیے اردو ناول بھی زندہ ہے اور فروغ پذیر ہے۔اکیسویں صدی کے اختتام پر اورخاص طور پر آخری دہائی میں یوں لگا کہ اردو ناول اپنی آخری سانسیںلے رہا ہے لیکن اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی اردو ناول نے اپنا جوبن دکھانا شروع کیااورایسے دور میں جہاں برقی کتابوں کے چلن کی بات ہو رہی ہے وہاں پاکستان اور ہندوستان میں مرزا اطہر بیگ کے غلام باغ اورشمس الرحمان فاروقی کے کئی چاند تھے سر آسماں جیسے ضخیم اور جدید اسلوب، ہئیت اور تکنیک کے حامل ناولوں نے قاری کی توجہ اپنی طرف مرکوز کی۔ اکیسویں صدی کے ان ۱۸ سالوں میںاردو میں لکھے گئے پاکستانی اور ہندوستانی ناولوں کی تعداد معتد بہ ہے اس لیے ا س مقالہ میں صرف آٹھ ناولوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں سے سات پاکستانی اور ایک ہندوستانی مصنف کے ناولوں کا مطالعہ پیش کیاہے۔ جن میں خالدہ حسین کا کاغذی گھاٹ، مرزا اطہر بیگ کا غلام باغ، صفر سے ایک تک، حَسَن کی صورت حال، محمد حمید شاہد کا مٹی آدم کھاتی ہے، حسن منظر کا دھنی بخش کے بیٹے، عبید اللہ بیگ کا راجپوت اور شمس الرحمان فاروقی کا قبضِ زماں شامل ہیں۔

۱۔کاغذی گھاٹ(۲۰۰۲ء)خالدہ حسین:

معروف علامتی افسانہ نگار خالدہ حسین کا ناول"کاغذی گھاٹ "۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں ناسٹلجیا ہےناول کے آغاز میں تین لڑکیوں کا تعارف ہےتینوں کے مزاج، خیالات اور طبیعت ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتےمونا، افروز اور عائشہ۔ مونا کے سکول اور کالج دور کے ساتھیوں میں انقلابی خیالات کے حامل بھی ہیں اور لایعنی زندگی گزارنے والے بھی جن کی زندگی کا مقصد مادی آسائش کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہیں۔وہ سکول اور کالج کے دنوں کو شدت سے یاد کرتی ہے:

"سب سے پر اسرار وہ ہال تھا جس کی اسٹیج پر طرح طرح کے ڈرامے ہوتے جن میں رقص ضرور ہوتا اور انہی دنوں یہ گیت بہت گایا جاتا کہ ناچو ناچو پیارے من کے مور۔۔۔اور اس اسٹیج پر وہ ڈرامہ بھی ہوا جس میں آزادی کا کوئی متوالا پھانسی چڑھ جاتا ہے اور پھانسی کے لیے بے شمار رنگیں دوپٹوں کو بٹ کر جنگلے کے ساتھ باندھا گیا اور اسٹیج کے وسط میں ایک رنگین ریشمی پھندا

Scanned with CamScanner

لٹکایاگیا۔۔اب یہ ہمالہ بھی ایک عجیب ہیئت تھی۔کبھی کوئی موٹا تازہ سیاہ فام سر پر سفید براق پگڑ پہنے اس کی نظروں میں گھوم جاتا۔'' ۱؎

مونا کی قوتِ مشاہدہ بہت اچھی ہے۔وہ حالات کے بدلتے منظر اوران کے انسانی زندگیوں پر اثرات کے ساتھ ساتھ رسوم و رواج کے خراب اثرات پر غور و فکر کرتی ہے۔وہ انسانوں کی بھیڑ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتی ہے۔اس کے سرکاری ملازم اور مذہبی والد، والدہ اور دیگر لوگ قدیم خیالات کے حامل ہیں۔مثنوی مولانا روم اس کے والد کی پسندیدہ ہے:

''بڑے ابا اس کو لوئی کی بکل میں لیے مثنوی مولانا روم پڑھتے۔کبھی کبھی ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے۔ پھر وہ تاریخ اسلام کا کوئی باب لے کر بیٹھ جاتے۔حضرت خالد بن ولید کی تیغ فضائوں میں بجلی کی طرح لہراتی، تڑپتی، الاماں، الاماں کی پکار اٹھتی۔گھوڑوں کی ٹاپیں اس کے دل کی باؤلی دھڑکن کے ساتھ مل جاتیں۔۔سازشوں کے جال بچھتے۔۔۔ ایک سرد آہ پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ پڑھ کے اس پر اور چاروں سمت دم کرتے۔سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی۔'' ۲؎

ناول کے تین نسائی کرداروں کے ذریعے خالدہ حسین نے تین مختلف فلسفۂ حیات بیان کیے ہیں۔ مونا، عائشہ اور افروز تینوں کردار اپنے اپنے مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔مصنفہ نے ناول میں ان کرداروں کویوں بیان کیا ہے:

''عائشہ اور افروزایک دوسرے کا تضاد تھیں۔ایک کسی بھی تہذیب، کسی بھی کلچر کی دعوے دار نہ تھی جبکہ دوسری کے پاس صدیو ں کا تہذیبی ورثہ تھا جس سے بچھڑ کر وہ گویا بہت غیر ترقی یافتہ نیم مہذب لوگوں میں آگئی تھی۔یہاں کے لوگ آداب محفل سے قطعی نا آشنا، زبان و بیان کی لطافت اور شائستگی سے عاری، کھردرے اور اجڈ تھے۔۔عائشہ کی تراش خراش اس طرح کی جا رہی تھی جس طرح کے ایک خاص عمرمیں لڑکیوں کی سوسائٹی میں متعارف کرایا جاتا ہے جبکہ وہ خود موٹا خوف اور تحفظ کی دھوپ چھائوں میں کھوئی ہوئی تھی۔'' ۳؎

کچھ مافوق الفطرت اور پراسرار کردار اور کہانیاں جو کہ ہمارے قدیمی معاشرے کا حصہ ہیں ان کا تذکرہ بھی ہے۔ ملنگ، مجذوب اور پیر بھی اس ناول کے کردارہیں۔ان کرداروں کا مشاہدہ مونا قریب سے کرتی ہے:

''نانی کے پاس کوئی بہت انہونی پر اسرار داستان تھی۔۔یہاں پر ایک غیر حاضر شخصیت کا سحر طاری تھا۔ماما عبداللہ اور بابا غلام محمد دونوں ہی سائیں توڑی شاہ کے مجاور بن چکے تھے ۔۔۔ماما کو اکثراشارے اور الہام ہوا کرتے تھے۔۔۔ان کا جنون ان کے کچھ بیٹوں میں بھی سرایت کر گیا تھا۔لہٰذا انہوں نے قوال پارٹی بنا رکھی تھی۔''۴؎

مونا اپنے گھرمیں الگ خیالات کی حامل ہے۔وہ ذرا آزادخیال ہے۔اور اپنے گھریلو ماحول اور نظام پر اندر ہی اندر نالاں ہے پر کسی سے اظہار نہیں کرتی۔مونا کا ایک بھائی اس کا ہم خیال ہے۔اس گھر میں اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ سو چتی ہے:

''اپنی دنیا کا حصار پا ر کرتے ہوئے اس پر شدید خوف اور آزردگی طاری ہو جاتی تھی مگر وہ کتنے جوش و خروش کے ساتھ یہ انقلابی نظمیں پڑھتی تھی۔ اسے دور دراز کے شہروں کا احساس

Scanned with CamScanner

ہونے لگاکتنے بے شمار شہر ہوں گے اور ا ن لوگوں کے گھر۔اس نے دہلی اور لدھیانے کا تصور کرنا چاہا۔مگر اس نے تو خود لاہور ہی جی بھر کے نہ دیکھا۔'' ۵ے

اس کی قریبی سہیلی افروز بائیں بازو کی انقلابی نظریات کی حامل ہے۔وہ اسے عصمت چغتائی کی کتب تھما دیتی ہے۔ اور مونا سے بائیں بازو کے مصنفین کی باتیں کرتی ہے۔ افروز کہتی ہے:

''اس آہنی نظام کو، اس شکنجے کو توڑنا اتنا آسان نہیں۔اس راہ میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔بس ایک طوق سے نکل کر آدمی دوسرے میں اسیر ہے۔'' ۶ے

اوراپنے نظریات بیان کرتے ہوئے وہ مزید کہتی ہے:

''اب انقلاب آنے والا ہے کیونکہ کسا ن پر بہت ظلم ہو رہا ہے اور زمیندار اور جاگیر دار انتہائی سفاک لوگ غریبوں کو بھوکا مار رہے ہیں اور درانتی کا نشان اب انسانیت کا پرچم بن رہا ہے اور روس تمام دنیا کو ظلم و ستم سے نجات دلا سکتا ہے۔اب وہ کرشن چندر اور بیدی اور منٹو اور پریم چند اور ترقی پسند افسانوں کے مجموعوں پر مجموعے لا کر اس کی تربیت کرتی رہتی۔ پھرسب جذبی مجاز فیض، سردار جعفری، سلام مچھلی شہری اور نا معلوم کس کس کو پڑھتے اور انقلابی منصوبے بناتے۔'' ۷ے

افروز ایک دن مونا سے کہتی ہے کہ آپس میں کٹ مرنے میں ہم پر کوئی بازی نہیں لے جا سکتا۔مونا اپنے آپ سے پوچھتی ہے کہ ملوکیت اور قبیلہ پرستی میں کیا فرق ہے یہ کیوں ختم نہیں ہوتے؟کربلا ہمارے ساتھ ساتھ کیوں سفر کرتی رہتی ہے ؟سابق مشرق پاکستا ن کے المیہ نے کیوں جنم لیا َ؟یہ مکتی باہنی والے لوگ اتنے سفاک کیوں تھے ؟ہمارا کلچر کیا ہے؟وغیرہ یہ سوالات اس کے ذہن میں باربار جنم لیتے ہیں۔

مونا کے خیالات ذرا الگ قسم کے ہیں۔وہ ہرتاریخی واقعہ کا جواز جاننا چاہتی ہے۔جیسا کہ َمحمود غزنوی نے بت شکن کہلوانا کیوں پسند کیا؟علائو الدین خلیجی چتوڑ کی رانی پدمنی پر عاشق کیوں ہوا اور چتوڑ پر حملہ کیوں کیا؟وغیرہ:

''اور تاریخ پلٹ گئی۔تاریخ واقعی پلٹ گئی تھی۔۔۔مگر رہ رہ کے اسے علائو الدین خلجی ضرور یاد آتا، جس نے راجپوت رانی پدمنی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چتوڑ پر چڑھائی کی اور آئینہ میں اس کا عکس دیکھ چکنے پر اس کی نیت بدل گئی اور پد منی کو حاصل کرنے کے لیے اس نے ریاست کی اینٹ بجا دی مگر وہ راجپوت عورتیں بھی خوب تھیں کہ جو ہرکی رسم ادا کرتے ہوئے جل کے راکھ ہو گئیں۔'' ۸ے

خالدہ حسین نے کاغذی گھاٹ میں۔جاگیر داراورسرمایہ دار کلاس کی تصویر کشی کرتے ہوئے ان کی ذہنی کیفیت اور ان کے حاکمانہ تربیتی نظام پر پھبتی کسی ہے اور اس نظام پر طنز کیا ہے۔خاص طوران کی خواتین کو نشان زد کیا ہے:

''لاہور جاگیردارانہ ماحول میں گھرتا چلا جا رہا تھا ۔۔۔ اپنے بیٹوں کو یورپ، برطانیہ اور بیٹیوں کو انگریزی اداروں میں تعلیم دلواتے تھے۔جو باہر نہ جاتے وہ اکثر لاہور کے چیفس کالجز اورکلیات میں داخلہ لیتے، جہاں ان کی رگ رگ میں تحکم اور دولت پرستی بھر دی جاتی۔۔جب بھی کسی گھر

Scanned with CamScanner

میں جاتیں دو دو خادمائیں، شوخ رنگ لاچوں میں ملبوس، جلو میں ہوتیں۔تب شاید ملکانی ہینڈ بیگ اٹھانا خلاف شان سمجھتی تھیں۔ادھر ان کے بلندو و بالا تندو مند بیٹے، لشکتے گھوڑوں پر سوار شہر کی سول لائنز پر اپنی چھپ دکھلاتے پھرتے۔'' ۹؎

کاغذی گھاٹ میں زندگی کے کئی رنگ دکھائی دیتے ہیں۔کاغذی گھاٹ عورت کا المیہ ہے۔خالدہ حسین کی ہیروئین مونافلسفۂ حیات پر ہی سوچ بچارکرتی رہتی ہے۔وہ اپنی زندگی کا حقیقی مقصد جاننا چاہتی ہے۔ دنیا میں لوگوں کی زندگیوں سے سبق حاصل کرکے آگے بڑھنا چاہتی ہے۔اس کے ساتھ وہ تھوڑی ناسٹلجک بھی ہے۔زندگی کے اہم لمحات کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

''اس کو ان کی تمام باتیں قطعی بے کا ر نظررہی تھیں۔وہ بات جو ہونا تھی ہو چکی تھی۔ایک مقدر کیا گیا لمحہ وارد ہو چکا تھا اور وہ پہلا موقعہ تھا جب اس نے اس قسم کے لمحے کو محسوس کیا اپنے اندر اور باہر کی دنیا میں۔ جب وہ اس کی وہ حس بیدار ہوئی جس نے اسے بتانا شروع کیا کہ کون سی ساعت ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے آئی ہے۔کیونکہ اس وقت کائنات تصویر سی ساکت ٹھہر جاتی ہے اور اپنی اس صورت کہینباطن میں مثبت ہو جاتی ہے۔'' ۱۰؎

ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔اس میں ہلکا سا وقت کا اشارہ بھی ہے:

''ایک لمحہ۔شاید ایک تیکھی دھار جو ہونے نہ ہونے کے درمیان معدوم سی پیوست تھی۔بس ایک لمحہ ہی سب کچھ تھا۔جو کچھ ہم نے آج تک سوچا، پڑھا محسوس کیا وہ محض ایک لمحہ ہے کہ رک جائے تو ابد ہو جائے۔جس کے آگے پیچھے کی کسی کو کچھ خبر نہیں۔ہر شے اپنا مفہوم بدل رہی تھی۔بدل چکی تھی۔زمین، آسمان، گھر، ان کے دریچے اور باغ اور اونچی منزلیں اور ممٹیاں سب کچھ اور نظر آرہی تھیں۔ان کے اوپر ایک سرخ لمحہ پھیل رہا تھا، جس کے سیاہ پر تھے اور آسمان کے ایک سرے نئے دوسرے تک پھیلے تھے۔'' ۱۱؎

کاغذی گھاٹ میں تین نسوانی کرداروں نے سرمایہ دارانہ، ترقی پذیر اور ترقی پسند فلسفۂ حیات کی نمائندگی کی ہے۔خالدہ حسین نے تینوں فلسفہ ہائے کا ایک موازنہ پیش کیا ہے اوران کرداروں کے ذریعے ان فلسفوں کے مباحث پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

۲۔غلام باغ(۲۰۰۶ء)۔مرزا اطہر بیگ:

اکیسویں صدی کا آغازاردو ناول کے لیے بڑا خوشگوار ثابت ہوا۔ایک ہی سال یعنی ۲۰۰۶ء میں دو شاہکار ناول''غلام باغ'' اور'' کئی چاند تھے سرِ آسماں'' شائع ہوئے۔۸۷۸ صفحات پرمشتمل مرزااطہر بیگ کا ناول 'غلام باغ' اکیسویں صدی کے نت نئے موضوعات اور فلسفہ ہائے لیے ہوئے غیر روایتی اندازمیں لکھا گیاہے۔یہ ناول اپنے اندر فلسفیانہ پس منظر رکھتا ہے۔اس ناول میں مابعد نوآبادیاتی صورتِ حال کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ ناول کا انتساب ''ارذل نسلوں کے نام'' ہے، جو انسانی فلسفۂ حیات کا منظر نامہ ہے۔مصنف کے بقول یہ ناول ۲۰۰۱ء میں مکمل ہو گیا تھا لیکن ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔

مرزا اطہر بیگ کے ناول غلام باغ کی اشاعت اردو فکشن کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے۔ بیسویں صدی کے فکشن میں ہونے والے مختلف النوع تجربات سے آگاہ قاری کے لیے غلام باغ کی

Scanned with CamScanner

نثر اور اس کا بیانیہ اجنبی نہیں ہے۔ مصنف نے روایتی زبان کے سانچے میں رہتے ہوئے غیر روایتی بات کر کے دکھائی ہے۔ زبان و بیان کا یہ سارا کھیل اپنے جوہر میں لمحۂ موجود کو گرفت میں لینے کا کھیل ہے۔

وقت غلام باغ کا اہم موضوع ہے۔ وقت کے بیان کے لیے مصنف نے ناول میں لفظ لمحہ کا کافی استعمال کیا ہے۔ ناول کی کہانی ماضی، حال اور مستقبل کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔ تاہم قاری کے لئے اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ کردار اس وقت کس کیفیت میں ہے بلکہ مصنف کے الفاظ میں کس لمحاتی کیفیت میں ہے۔ اگر ہم کہیں کہ 'غلام باغ' اور' آگ کا دریا' میناس تناظر مینقریب قریب مماثلت ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ لیکن مرزا اطہر بیگ نے اسے ایک بالکل الگ طریقہ کار سے برتا ہے۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے عارف وقار لکھتے ہیں:

"مرزا اطہر بیگ نے صورتِ حال کو اپنے لئے اِس سے بھی زیادہ پیچیدہ یوں بنا لیا ہے کہ وہ گزرتے وقت میں موجود ایک سے زیادہ اعمال و افعال کو بیک وقت اپنے بیانیے کی گرفت میں لینے کی سعی کرتے ہیں۔ہم سب کا روزمرہ تجربہ ہے کہ ہر لمحے ہمارے ارد گرد زندگی کہلانے والے ہنگامۂ رستخاخیز کے کئی مناظر چل رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً راہ چلتے ہماری جیب سے اگر ایک سکّہ زمین پر جاگرے تو ہم شاید خود کو لعن طعن کریں گے، سوچیں گے کہ اسے اُٹھانے کے لئے زمین پہ جھکنا چاہیے یا اس نقصان کا کڑوا گھونٹ بھر کے آگے نکل جانا چاہیے۔ اگر ہمارا کوئی ہم سفر بھی ہے تو شاید وہ بھی سِکے کے بارے میں اور خود ہمارے بارے میں کوئی رائے قائم کر رہا ہوگا۔ سڑک کے پار کھڑے ایک بھکاری نے اگر سکّہ گرتے دیکھ لیا ہے تو وہ الگ اس تک رسائی کی منصوبہ بندی کر رہا ہوگا۔" ۱۲؎

ان مناظر میں قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ ہم، ہمارادوسرا اورکوئی تیسرا فرد جو کچھ بھی سوچ رہے ہیں یا کر رہے ہیں وہ تمام اعمال بیک وقت سرزد ہو رہے ہیں۔تحریری طور پر ان کا بیان آگے پیچھے الگ الگ ظاہر ہوتا ہے۔اس طرح کے کسی بیان کی کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ یہ تینوں اعمال آگے پیچھے آنے کی بجائے اپنی مساوی اہمیت کے ساتھ بیک وقت بیان ہوسکیں؟ مرزا اطہر بیگ اپنے ناول میں عملی طور پر اس سوال کا جواب دیتے نظر آتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر سہیل احمد خان:

"غلام باغ ایک بہت وسیع دائرے کا ناول ہے۔ اس کے بیانیے میں ماضی کی آسیبی پرچھائیاں، حال کی بے ترتیبی اور مستقبل کا الجھاؤ ایک دوسرے سے متصادم دکھائی دیتے ہیں۔ اس تصادم سے جو شور پیدا ہوتا ہے وہ ہماری موجودہ عصری کیفیت کا شور ہے۔" ۱۳؎

غلام باغ میں چار مرکزی کردار ہیں۔کبیر، ناصر، ہاف مین اورزہرہ۔یہ کردار نوجوان ہیں۔ کبیرجو کہ ناول کا ہیرو ہے، ایک لکھاری ہے جو اپنی گزر اوقات کے لئے مختلف رسالوں میں مختلف قلمی ناموں سے کہانیاں اور مضامین لکھتا ہے۔کبیر کا کہنا ہے کہ اپنی زندگی کی بہترین کہانی اس نے ابھی لکھی ہی نہیں اور جب بھی وہ کہانی لکھے گا، اس کہانی کو وہ اپنے اصلی نام سے پیش کرے گا۔ مصنف نے اسے بیک وقت مفکر اور فلسفی اور' نظریہ باز' کے روپ میں پیش کیا ہے۔دوسرا اہم کردار کبیر کا دوست ڈاکٹر ناصرہے۔ناول میں ناصر کی ڈیوٹی ہسپتا ل کے سائیکاٹری وارڈ میں ہے۔تیسرا اہم

Scanned with CamScanner

کردار ایک جرمن آرکیالوجسٹ ہاف مین ہے جوجرمنی کی کسی یونیورسٹی کی طرف سے غلام باغ کے کھنڈرات کی تحقیق کے لئے آیا ہوا ہے۔ 'غلام باغ کا معمہ 'اس کی تحقیق کا موضوع ہے۔چوتھا اہم کردار ناول کی ہیروئن ہے جس کا نام زہرہ ہے جو مردانہ طاقت بڑھانے کی دوائیں بنانے والے ایک عطائی کی بیٹی ہے۔ زہرہ کو کبیر، ناصر اور ہاف مین تینوں سے محبت ہو جاتی ہے۔بعد ازاں وہ صرف کبیر کی ہو کررہ جاتی ہے، لیکن کبیر کی موت کے بعد ڈاکٹر ناصر سے مل جاتی ہے۔ناول میں بہت سے کردار ہیں جن میں کچھ مرکزی اور کچھ ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ بنیادی کردار شروع سے آخر تک ناول کی کہانی میں شامل رہتے ہیں اور ثانوی کردار اپنے اپنے حصے کا کام کر کے پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ثانوی کرداروں میںاور عطائی، نواب ثریا جاہ نادر جنگ، امبر جان، نجم الثاقب، گرٹریوڈ، مدد علی، عاشق علی، نرس مختار، پیرانائیڈ عورت اور امداد حسین کو رکھا جا سکتا ہے۔اپنے اسلوب، ہیئت، تیکنیک اور کرداروں کی بنیاد پر ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ مجموعی طور پہ غلام باغ اک منفرد ناول ہے۔

۳۔مٹی آدم کھاتی ہے(۲۰۰۷ء)محمد حمید شاہد:

'مٹی آدم کھاتی ہے' جنوری۲۰۰۷ء میں اکادمی بازیافت کراچی نے شائع کیا۔اس ناول میں ایک شخص اپنے باپ سے محروم ہو جاتا ہے، دشمن کے ہاتھوں نہیں یہ اس کے اپنے ہی ہیں جو اس کی موت کے ذمہ دار ہیں۔ ایک عورت کو اس کے اپنے گولی مار دیتے ہیں، کیوں کہ وہ انہیں چھوڑ کرجانا چاہتی ہے۔ایک شخص جسے بچ رہنے کا کوئی حق نہیں وہ لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہوتے ہوتے بچ نکلتا ہے۔لیکن جو بچ نکلا، وہ بچا نہیں۔۔دکھ کی چادر بیمار اور صحت مند، قوی اور ضعیف، سب کو ڈھک لیتی ہے۔مٹی آدم کھاتی ہے اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میںبنگلہ دیش کی حقیقت سے آنکھ ملانے کی کوشش رومان اور تشدد کو یکجا کر دیتی ہے۔ناول کے دیباچہ میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"مٹی آدم کھاتی ہے اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں مشرقی پاکستان / بنگلہ دیش کی حقیقت سے آنکھ ملانے کی کوشش رومان اور تشدد کو یکجا کر دیتی ہے۔اسے محمد حمید شاہد کی بہت بڑی کامیابی سمجھنا چاہیے کہ وہ ایسے موضوع کو بھی اپنے بیانیہ میں بے تکلف لے آتے ہیں۔" ۱۴؎

اس ناول میں دو راوی ہیں۔ اس پوری داستان کا مسودہ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے زلزلے کے بعد بر آمد ہوا۔ راوی بڑے دکھ سہتا ہے۔اس کے باپ کو بڑے خان کی وفات کے بعد جائیداد میں حصہ نہیں ملتا۔ راوی کم عمر ہونے کی وجہ سے بڑے خان جی مرحوم سے انتقام نہیں لے سکتا۔ اس کاباپ بھی سے کمزوری کی بنا پر انتقام نہیں لے سکتا۔اور اسے ایک کار حادثے میں مروا دیا جاتا ہے پھر چھوٹے خان جی پاسنگ آئوٹ پریڈ میں کیپٹن سلیم اللہ یعنی بھتیجے کے پاس بڑی محبت سے تشریف لاتے ہیں۔وہ اپنی آوارہ مزاج بیٹی کی شادی اس سے کرنا چاہتے ہیں۔

برآمدہ مسودے کے آخر میں ہابیل، قابیل اور مولوی دوزخی کے نام لکھ کر کاٹے گئے ہوتے ہیں۔مولوی دوزخی وہ کردار ہے جو ہمیشہ لوگوں کو دوزخ کے عذاب سے ڈراتا رہتا ہے۔اسی طرح

Scanned with CamScanner

قابیل اور ہابیل کی تلمیح اور زلزلے کا تذکرہ بھی مٹی کے حوالے سے اہم اور معنی خیز ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خاں مٹی آدم کھاتی ہے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آخرمٹی ہی تو اس کا فکری محور ہے۔مٹی کی محبت میں دیوانے ہو جانے والوں کی نفسیاتی گرہ کشائی ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر تی ہے۔مٹی کی محبت کے بھیانک انجام پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ظاہر ہے کہ بات دور تک چلی جاتی ہے اور مٹی کے ابعاد(Dimensions) کو بھی واضح کرتی جاتی ہے۔'' ۱۵؎

۴۔دھنی بخش کے بیٹے (۲۰۰۸ء)۔حسن منظر:

حسن منظر کے ناول 'دھنی بخش کے بیٹے ' میں آئیڈیالوجی اور تھیم دونوں موجود ہیں۔ اس کا تھیم دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔'دھنی بخش کے بیٹے 'میں ایک جاگیر دار طبقے کو پیش کیا گیا ہے۔ دو مرکزی کردار شخصیت کے لحاظ سے مشرق و مغرب کے مانند ہیں۔یہ ایک طبقاتی سماجی نظام ہے۔اس ناول میں نفسیاتی پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے ضمیر کو وقت کے دورانیے میں سفر کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔زمان و مکاں کو ایک الگ انداز میں بیان کیا گیا ہے:

''بس وہ وقت تھا جب میں اپنی روح کھو بیٹھا اور اب تک اس کی تلاش میں ہوں ۔۔جس دن میں نے ریسٹورنٹ میں دیکھا میز پر رکھے ہوئے پانی کے جگ ہوا میں تیر رہے ہیں میں گھبرا گیا اور لو کائی کے پاس گیا اس کے کمرے میں شیشے کا ایک بڑا سا گھر ہے جیسا لوگ مچھلیوں کے لیے رکھتے ہیں۔ اس میں رات کو اس کے پرکھوں کی روحیں آتی ہیں۔ اس ے کہا ''خیریت سے ہو'' میننے کہا ''ہاں'' میں نے جھوٹ بولا تھا۔ پھر میں نے اس کو سارا حال بتایا کہ کیسے میں اپنی روح کھو بیٹھا ہوں۔''۱۶؎

ناول کے اس حصے میں راوی ہمیں ایک ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جس سے ہم ناواقف ہیں یعنی روحوں کی دنیا میں۔ یہاں پر زمانی انتقال واقع ہو تا ہے قاری حقیقت کی دنیا سے نکل کر ایک ان دیکھی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ کردار راوی (چاکروان) جو کہانی بیان کرتا ہے کہ اس کی روح کھو گئی ہے وہ قاری کو چند لمحوں میں ہی کسی اور دنیا کی سیر کرواتا ہے۔ درمیان میں ایک بہت بڑا وقتی خلا ہے جس کے متعلق نہ ہم جانتے ہیں اور نہ راوی نے وضاحت کی ہے۔ ناول کی دنیا میں اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔روبینہ سلطان اس ناول کے متعلق لکھتی ہیں:

''حسن منظر کے ناول 'دھنی بخش کے بیٹے 'کے لیے جو انہوں نے اسلوب اختیار کیا ہے سادہ اسلوب ہے اور بہت جدید قابل اعتماد اور اثر انگیز ہے انہوں نے بہت زیادہ تصنع اور بناوٹ سے کام نہیں لیا۔''۱۷؎

مصنف نے سندھ کے ایک دور افتادہ دھنی بخش کے ایک خاندان کی کہانی بناکر یہ ناول رقم کیا ہے۔ناول کے مرکزی کردار کے والد کے نام پرگائوں کا نام ہے۔ناول کی پوری کہانی اسی کے خاندان کے گردگھومتی ہے۔ اس ناول کا بنیادی موضوع اعلیٰ طبقے کا صدیوں سے بنایا ہوا استحصالی نظام اور اس کے شکنجے میں کسے ہوئے غریب عوام ہیں۔طُرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ مظلوم طبقہ اپنی اس حالت پر قانع ہے۔

Scanned with CamScanner

مصنف نے ناول کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے تین حصوں کو مختلف رُتوں کا نام دیا گیا ہے پہلی رُت آرزو کا آغاز دھنی بخش کے بیٹے احمد بخش کی امریکہ سے واپسی پر ہوتا ہے۔اس کا بڑا بھائی علی بخش ہے جس کی سوچ کا دائرہ شراب، کباب اور شراب میں مقید ہے ناول کے دو اہم واقعات کہانی کا رخ تبدیل کرنے والے ہیں۔احمد بخش کو پہلے اپنا کمرہ، پھر گھر اور آخر میں ملک ہی چھوڑنا پڑتا ہے۔احمد بخش اس معاشرے میں مس فٹ ہونے کی وجہ سے امریکہ جاتا ہے۔واپس آکر وہ بعد میں اپنے بچوں کو پاکستان لانے اور ایک مصلح کا کردار اداکرنے کا بھی سوچتا ہے۔اُسے معاشرتی برائیوں سے نفرت ہے:

''میرا دماغ دن رات، صبح آنکھ کھولنے پر اور رات کو نیند کو بلاتے وقت مجھ سے بے ضرورت سوال کرتا رہتا ہے آخر اس ملک کو بیماری کیا ہے جو پہلے دکانداروں کو لگی کہ تولتے کم ہیں، ناپتے کم ہیں۔ پھرسوسائٹی میں امن اور قانون نافذ کرنے والوں کو لگی اور ان سے پھیلتی پھیلتی انصاف گاہوں تک جا پہنچی۔اور وہاں سے آکاس بیل کی طرح اس نے ہر پاس اُگی ہوئی جھاڑی، ہرہرے بھرے درخت کو جکڑ لیا۔۔۔ایسا تو نہیں کہ معاشرے کی آکاس بیل کو اگر نوچ کر پھینک دیا جائے تو اس کے ساتھ معاشرے کی ہریالی بھی ختم ہو جائے۔''۱۸؎

دھنی بخش کے خاندان میں ہی دو تہذیبوں کے تضادات بیان ہوئے ہیں۔روبینہ سلطان نے اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے اس پہلو کو زیادہ اجاگر کیا ہے۔وہ لکھتی ہیں:

''دھنی بخش کے بیٹے کی آئیڈیالوجی میں دوتہذیبوں کا تصادم اور اس مینپائی جانے والی برائیوں اور کمزوریوں کو منظرعام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ '' ۱۹؎

علی بخش اور احمدبخش دو متضاد کردارہیں۔احمدبخش کا کردار جتنا مثبت ہے اتنا ہی علی بخش کا کردار غلیظ اور منفی ہے۔ طُر ہ یہ کہ ماحول بھی علی بخش کی بد کاریوں کے لیے معاون ہے۔ جنس اور شراب کے بغیر اس کا کردار ہی ادھورا ہے دنیا جہان کی برائی اس میں سمائی ہوئی ہے۔ایک نابالغ اور زر خرید لڑکی سے بدکاری اس کے کردار کو اور زیادہ مکروہ بنا دیتی ہے۔علی بخش کے شراب اورشباب ہی سارا کچھ ہے۔

دھنی بخش کے بیٹے مینمعاشرتی کمزوریوں، برائیوں، انسانی کجیوں کے ساتھ ساتھ مثبت کردار بھی موجودہیں جو کہ اصلاح اوراچھائی کے علمبردار ہیں۔غفور احمد دھنی بخش کے بیٹے پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس ناول میں وہ ہمارے معاشرتی ناسوروں اور فرسودہ روائتوں، جاگیردارانہ نظام میں جکڑے ہوئے غریب اور محنت کش عوام، سب دکھوں کی مسیحائی کرتے نظر آتے ہیں۔احمد بخش اور علی بخش کی کردار نگاری میں کچھ افراط و تفریط کے علاوہ انہوں نے حقیقت پسندی کو بڑی حد تک نبھایا ہے۔''۲۰؎

۵۔راجپوت (۲۰۱۰ء)۔عبیداللہ بیگ:

عبیداللہ بیگ کے دو ناول شائع ہوئے۔ان کا پہلا ناول'اور انسان زندہ ہے' ان کے تجربات، احساسات اور مشاہدات کا آئینہ دار ہے۔ان کا دوسرا ناول'راجپوت'کے نام سے شائع ہوا۔اس ناول میں انھوں نے

Scanned with CamScanner

تاریخ کے مسلسل عمل کی جانب متوجہ کیا ہے۔ایک وسیع المطالعہ ادیب کی حیثیت سے ان کا اسلوب ان کی عظمت فکر اور روحانی بالیدگی کا عمدہ نمونہ ہے۔ان کے ناول اورافسانے جدت، ندرت، رفعت تخیل اور پر تاثیر جذبات کے امین ہیں۔ان کے مطالعہ سے جمود کاخاتمہ ہوتا ہے اور قاری کے متخیلہ میں ایک ہلچل پیدا ہوتی ہے۔

جب ہم راجپوت ناول پڑھنا شروع کرتے ہیں تو یہ ہمیں ایک شکاری کی آپ بیتی لگتا ہے جو بعد ازاں ایک مہم جُو بن جاتا ہے۔دراصل پس ِ منظر میں آزادی کی تحریک اس ناول کی کہانی میں شامل ہے۔راوی اپنی شکاری زندگی کو بیان کرتے ہوئے ایک نئی مہم کے آغاز کی طرف لے جاتا ہے۔اس میں کہیں کہیں وہ اپنا فلسفہ بھی بگھارتا ہے۔ جاسوسی اورمذہب بھی اس ناول میں استعما ل ہوئے ہیں۔زندگی کی بے ثباتی اور پھر جینے کی امید اور جینے کا حوصلہ انسان کی زندہ رہنے کی خواہش اور اس کے لیے جدوجہد اور کشمکش کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔مصنف ایک جگہ پر لکھتا ہے:

”یہ سب یوں ہوا تھا کہ میں صبح سے پے در پے کئی بارناگہانی موت کا شکار ہونے سے بچا تھا اور ان سب کا اثر یہ تھاکہ میرے تحت ا لشعور میںانسانی زندگی کی بے ثباتی اور بے مائیگی کی حقیقت پر پڑے ہوئے پردے اُٹھ رہے تھے۔میں انسان تھا۔۔میں بہادر تھا مگر نہیں۔۔میں بزدل تھا۔“۲۱؎

اپنے میزبان پر قاتلانہ حملے کے بعد راوی پر زندگی کی کئی پرتیں کھلتی ہیں لیکن اس کے لیے زندگی کا عقدہ وا نہیں ہوتا۔ اس ناول میں بھی انسان کی کشمکش اور ایک نسل کی دوسرے پر غلبے کی خواہش کو دکھایا گیا ہے۔ اس ناول میںدولت انسان کا سب سے بڑاخدا نظر آتا ہے۔انسان اپنی زندگی کے مقاصد کے حصول میں بے بس نظر آتا ہے۔مصنف راوی کے ذریعے ان خیالات کا اظہار اس طرح سے کرتا ہے:

”غم اور غصے کے جذبات سے چور میں میدان کے کنارے زمین پر بیٹھ گیا، نظریں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور میں سوچنے لگا خدایا کیا زندگی کا انجام ہونا ضروری ہے۔۔۔لیکن قضا و قدر کے آگے انسان بے اختیار ہوتا ہے۔“ ۲۲؎

ایک مقام پر مصنف انسان کی لاعلمی پر رشک کرتا ہے۔اسے چھوٹے بچوں کی بے فکری اور گائوں والوں کی سادگی پر رشک آتا ہے۔اس کے نزدیک کچھ لوگوں کا فلسفہ زندگی کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔وہ اس منظرکو اس طرح بیان کرتا ہے :

”کیسی بے فکری، کیا سادگی اور سیدھی سادی زندگی تھی، مجھے ان پر رشک آنے لگا، ان بے چاروں کو کیا معلوم اس دنیا میں کیسی عجیب عجیب باتیں اور کیسے کیسے کردہ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔“۲۳؎

ناول کا ہیرواور راوی خفیہ جاسوسی کے لیے ایک جوگی بابا کا روپ دھار کر جنگلوںاور پہاڑوں میں گھس جاتا ہے جہاں اس کی ملاقات اجڈ اور ان پڑھ دیہاتیوں سے ہوتی ہے۔وہ سماج سدھار کے کام میں لگ کر ان دیہاتیوں کو سدھارنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے اسے آگے اپنے مشن پرجانا پڑتا ہے۔وہ اپنی گفتگو اور تقریروں سے دیہاتیوں کو زندگی کا مقصد اور فلسفہ سمجھانے کی اس طرح کوشش کرتا ہے:

Scanned with CamScanner

”بہنو، بھائیو اوربچو! اس دنیائے ناپائیدار میں کوئی سنگت دائمی نہیں۔زندگی اونچے آکاش پر ڈولتے بادلوں کی طرح بودی اور ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔جو ہوا کو چھوٹے چھوٹے جھونکوں پر ڈولتے پھرتے ہیں اور لا محدود وسعتوں میں کھو جاتے ہیں۔سمے بہتا پانی ہے۔۔۔لہروں کوکون گن سکتا ہے۔۔۔کون آیا کون گیا، کون جانے۔“۲۴؎

راجپوتوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ دراصل ایک جنگجو قوم ہیں۔یہ ناول بھی راجپوتوں کی جرأت و بہادری پر لکھا گیا ہے۔انیسویں صدی میں جہاں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوا وہاں راجپوتوں کے اقتدار کا بھی خاتمہ ہونے لگا۔رزم و بزم، محبت و عشق کی طرح حیاتِ انسانی کے لوازمات میں شامل ہے۔اس ناول کے بارے میں رئیس فاطمہ لکھتی ہیں:

”دراصل یہ ایک رزمیہ داستان ہے۔اس کا پس منظر دوسری جنگ عظیم کے بعد کا ہندوستان ہے، جب ملک بھر میں آزادی کی تحریک زوروں پرتھی۔۔ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو آزادی ملنے کے بعد اپنے مستقبل کے لیے پریشان تھاکیونکہ کانگریس نے اپنے مینی فیسٹو میں واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آزادی ملنے کے بعد ۱۹۵۴ء تک تمام ریاستوں اور رجواڑوں کو ختم کر دیا جائے گا۔۔رجواڑوں اور جاگیر داری نظام کے خاتمے سے سب سے زیادہ خطرہ راجپوتوں کو تھا۔“۲۵؎

ناول میں ہیئت و تکنیک میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ناول کی ہیئت و تکنیک پر تبصرہ کرتے ہوئے غفور احمد لکھتے ہیں:

”عبید اللہ بیگ کا یہ ناول اکیسویں صدی کی ناول نگاری میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔اس کے پلاٹ میں الجھاؤ ہے نہ اسلوب میں پیچیدگی، زبان و بیان کی روانی اور لہجے کی پختگی اسے ایک وقار عطا کرتی ہے۔“ ۲۶؎

۶۔صفر سے ایک تک (۲۰۱۲ء)مرزا اطہر بیگ:

کمپیوٹر کی دنیا میں صفر سے ایک تک (0-1) بائنری نظام ہے۔بائنری نظام ہندسوں، الفاظ، آوازوں، احکامات اورتصاویرکو ظاہر کرنے کا ایک نظام ہے۔یہ نظام صرف0 اور1 کے ہندسے استعمال کرتا ہے۔یہ نظام ان ہندسوں کو بلا ترتیب استعمال کرتے ہوئے ہندسے، الفاظ، آوازیں، احکامات اورتصاویربناتا ہے۔مرزا اطہر بیگ نے بھی کمپیوٹر کی اسی زبان کو سامنے رکھتے ہوئے ناول کا نام رکھا ہے۔اگر تھوڑا ساغور کریں تو ناول کاذیلی عنوان سائبر سپیس کا منشی ہے۔ ناول کے نام سے پتا چلتا ہے کہ0 سے 1تک پہنچنے میں کتنا وقت درکار ہوتا ہے۔ ناول کی تمام کہانی اور کردار کمپیوٹر سے منسلک دکھائے گئے ہیں۔مرزا اطہر بیگ لکھتے ہیں:

”کمپیوٹر فالتو باتیں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا جب کہ انسان یہ صلاحیت رکھتا ہے ۔۔۔ کمپیوٹنگ، پروگرامنگ۔۔ مجھے دو اور دو چار بلکہ اب تو کہنا چاہیے کہ ون زیرو اور ون زیرو ون زیرو زیرو کی جکڑ بند میں واپس کھینچ لاتے ہیں۔۔ اصل جکڑ بند تو تمام دنیا میں اب اسی زیرو ون کی ہے سارا کھیل ہی صفر سے ایک تک کا ہے۔“ ۲۷؎

مرزا اظہر بیگ کے اس ناول کے ہیروذکی کا باپ، عطاء اللہ سالاروں کے پاس منشی ہے۔ عطا اللہ کا باپ اور اس کا باپ سب منشی گیری کرتے تھے۔ زمینوں، جاگیروں کا حساب کتاب رجسٹروں میں

Scanned with CamScanner

محفوظ رکھتے تھے۔ جبکہ ان لوگوں کی حرکتوں کا بھی حساب کتاب وہ کمپیوٹر کی مانند محفوظ رکھتے تھے یعنی 01010101 کی طرح لیکن اپنے ذہن اور زبان پر تالے یعنی password لگاکر رکھتے ہیں۔اس حساب کتاب کا password کھولنے سے وائرس ایسے آجاتاہے جیسے ان کے زبان کے کھولنے سے ملک الموت کی آمد۔

یہ مرزا اطہر بیگ کا کمال ہے کہ انہوں نے ایسا ناول لکھا ہے جو جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی کے دور میں اپنی الگ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ پوسٹ ماڈرن فکشن ہے۔مصنف حقیقی دنیا سے واقعات لیتا ہے اور انہیں اپنی ادبی صلاحیت سے ایک کہانی کی طرح قاری کے سامنے لاتا ہے۔یہی مصنف کے اسلوب کی خاصیت ہے اور تکنیک بھی۔

صفر سے ایک تک میں دو متوازی کردار ذکی اور فیضان سالارہیں۔ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ذکی کو ہیرو اور سالاروں کے بیٹے فیضان کو شریک ہیرو (Co-Hero)کہتے ہیںکیونکہ دونوں متوازی طور پر چلتے نظر آتے ہیں۔ ذکی کے والد، دادا اور پھر ان کے باپ اور دادا سالاروں کے منشی ہیں۔ یہ لوگ سالاروں کے خلاف انقلاب لانے یا مخالفت کرنے کا خیال تک ذہن میں نہیں لاسکتے لیکن ذکی کمپیوٹر کی دنیا کا آدمی ہے اور انٹرنیٹ کے ذریعہ مکانیت سے ماورا ہو کر لامکانیت کا کل پرزہ بن چکا ہے۔ناول کا تیسرا کردار زلیخا خلجی ہے۔جس کا باپ فرانس میں ہے، اس کی ماں فرانسیسی ہے اورباپ پاکستانی۔ باپ اسے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں پاکستان ہی میں رکھوانا چاہتا ہے۔فیضان سالارایک لیکچرار ہے جو اپنے مقالے'' اکیسویں صدی توقعات اور خدشات'' کے لیے انٹرنیٹ کے ماہر ذکی سے مددچاہتا ہے۔ذکی کا بھائی ثناللہ ایک اور اہم کردار ہے جو جعلی پیر بنا ہوا ہے اور اس نے اپنے سائن بورڈ پر بھی جعلی پیر لکھوایا ہوا ہے۔بعد ازاں وہ اپنا کاروبار تبدیل کر لیتا ہے اور سوٹ بوٹ پہن کر ثقافتی طائفوں کومشرق وسطیٰ لے کر جاتا ہے۔

صفر سے ایک تک ہمارے معاشرتی نظام پر ایک بھر پور طنز ہے۔ہر اہم کردار، زبان و بیان، منظر کشی سب مل کر ناول کو Comic ralism کی طرف لے جاتے ہیں۔اس ناول میں معاشرے کی استعاراتی عکاسی کی گئی ہے۔جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے کھاتے بنائے اور بیان کیے گئے ہیں۔عارف وقار لکھتے ہیں:

"The fact is that there seems to be nothing traditional in the novel, which is basically a study of the deeper power structures of Pakistani society as metamorphosed during the last three decades of the 20th century through the global phenomena of information technology and its myriad manifestations like personal computers, cell phones, internet, e-mailing, chatting, instant messaging and so on. The intervention of these apparently post-modern technologies in our pre-modern society has given rise to bizarre socio-cultural situations and grotesque subjective and interpersonal formations. The novel can rightly claim to be first such attempt to unravel the

Scanned with CamScanner

complexities of an unprecedented social condition, which perhaps should by now have caught the eyes of our sociologists." (28)

پوسٹ ماڈرن فکشن میں'غلام باغ' اور' صفر سے ایک تک 'کے مقام اور ان میں وقت کے حوالے سے ڈاکٹرممتاز احمد خاں'اردو ناول کے چند اہم زاویے 'میں لکھتے ہیں:

''نقاد عارف وقار کی مندرجہ ذیل رائے سے'صفر سے ایک تک' سے اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ابھرنے پاتی۔وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ مرزا اطہر بیگ کے کردار زمان و مکان کی روایتی بندشوں سے آزاد ذہن ہیں گویا خود بھی ایک لا مکان میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔مصنف کو احساس ہے کہ آج ہم ایک عالمی وقت میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں فاصلوں کا تصور مٹ چکا ہے۔'' ۲۹؎

۷۔قبض زماں (۲۰۱۴ء)شمس الر حمٰن فاروقی:

قبض۔ زمان حال ہی میں منظر عام پر آنے والا ناول ہے۔اس ناول کا خاص موضوع ہی زماں ہے۔جس کی وجہ سے اس نے شائع ہوتے ہی قارئین میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔اس کا سب سے اہم اقتباس وہ شیخ ابن سکینہ کا وہ قول ہے جو ناول کے شروع میں ہی دیا گیا ہے یعنی:

''شیخ ابن سکینہ نے فرمایا ۔۔ ۔ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ اپنے کسی بندے کے لیے زمانے کو پھیلا دے اور وقت کو دراز کر دے جبکہ دوسروں کے لیے بدستور کوتاہ رہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ قبض۔ زمان فرماتا ہے کہ زمانۂ دراز کوتاہ معلوم ہوتا ہے۔'' ۳۰؎

اسی نکتہ نظر کو لے کر مصنف آگے بڑھتا ہے اور اس ناول کے اہم کردار گل محمد کے ذریعے قاری کو زمان کی سیرکرواتا ہے۔قبض زماں کا اہم کردار گل محمد ایک بے چین روح ہے۔کئی چاند تھے سر آسماں کے بعدشمس الرحمٰن فاروقی ایک دفعہ پھر اپنے قاری کو تاریخ اسلامی کی سیر کرواتے ہیں۔ایک عام آدمی سفر کرتے ہوئے اپنے آپ کو عجیب و غریب حالات میں پاتا ہے۔وہ اپنے آپ کو کسی اور دور میں موجود پاتا ہے۔وہ اپنے آپ کو ایک اجنبی شہر میں پاتا ہے۔وہاں وہ مسجد زینت النسا اور اورنگ زیب کی شہزادی زینت النسا کی قبر دیکھتا ہے۔پھر اسے پتہ چلتا کہ کہ وہ ۱۷۰۷ ء میں ہے۔جبکہ اُس کی یادداشت اسے بتاتی ہے کہ وہ ۱۵۲۰ء میں سلطان ابراہیم لودھی کے دور حکومت میں تھا۔اس صورت۔ حال سے وہ پریشان ہو جاتا ہے۔جبکہ اصل میں سامع کردار بیسویں صدی کا ہے۔یہ اُس آدمی کی کہانی ہے جو اپنا ہی وقت گم کر بیٹھتا ہے۔اور دو سو سال آگے چلا جاتا ہے۔انتظار حسین اس صورت۔ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"So this is the story of a man who has lost his own time. Mysterious circumstances pushed him in a time far ahead from his own. What a fantastic experience. And how to capture it in words - a wonderstruck soul thrown into another time. But Faruqi has managed to capture the experience in a dexterous way." (31)

راستے میں ڈاکوئوں سے لٹنے کے بعد امیر جان سے قرض لینے اور پھر اسے واپس کرنے جانے پر اسے امیر جان کی موت کا پتہ چلتا ہے توہ اُس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہے۔قبر میں اسے ایک

Scanned with CamScanner

راستہ دکھائی دیتا ہے۔وہ داخل ہو جاتا ہے۔ امیر جان سے ملاقات ہوتی ہے پر وہ اسے دھکے دے کر نکال دیتی ہے۔قبر سے باہر آنے پر اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ قبر میں اڑھائی گھنٹے نہیں بلکہ اڑھائی سو سال گزار کر آیا ہے۔اس پر وہ ذہنی خلفشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ڈاکٹر محمد سلمان بھٹی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سوال اٹھاتے ہیں:

''گل محمد کا واقعہ یہ سوال بھی اُٹھاتا ہے کہ کیا گل محمد زمینی وقت سے نکل کر الٰہیاتی وقت میں داخل ہو گیا تھا ؟اگر ایسا ہوا تھا تو الٰہیاتی وقت اور زمینی وقت کی رفتار میں عدد مشترک کیوں ہے۔الٰہیاتی وقت کس طرح پھیلتا ہے کہ عدد کے مشترک ہونے کے باوجود بہت طویل ہو جاتا ہے اور اس کا مشاہدہ صرف ایک ہی انسان کو کیوں ہوتا ہے۔''۳۲؎

قبض ِ زماں اس نوعیت کا پہلا ناول نہیں ہے۔لیکن جس انداز میں مصنف نے وقت کو پیش کیا ہے وہ قاری کو حیران اور ششدر کر دیتا ہے اور اس کے ذہن میں کئی سوالات پیدا کرتا ہے۔وقت کو بیان کرتے ہوئے ناول نگار تاریخی واقعات بھی بیان کرتا ہے۔اور تاریخی شہروں کی منظر کشی بھی کرتا ہے۔اُس دور کی ثقافت، طرزِ گفتگو، رہن سہن اور جنگی معاملات بیان کرتا ہے۔اس طرح ہم تین مختلف ادوار کی ثقافت اور اس دور کے لوگوں کے حالات زندگی پڑھتے ہیں۔

۸۔حسن کی صورتِ حال(۲۰۱۴ء)۔مرزا اطہر بیگ:

حسن کی صورتِ حال، خالی۔۔ جگہیں۔۔ پر۔۔ کرو۔ایک غیر روایتی ناول ہے جس میں ایک دلچسپ صورت حال پیش کی گئی ہے۔ مرزااطہر بیگ نے ۲۰۰۹ء میں مختصر افسانہ ''اچٹتے خوف کی داستان'' لکھا تو محسوس کیاکہ اس میں پھیلائو کی کافی گنجائش موجود ہے اسی پھیلائو کو ۶۰۰ صفحات اور ۲۱ ابواب پر مشتمل ضخیم ناول بنادیا۔اس ناول میں انسانی کرداروں کے ساتھ ساتھ کچھ غیر انسانی کردارجیسے میگافون، پیپر ویٹ، انگوٹھی، بوتل اور گول میز بھی موجود ہیں۔ ناول میں فلم اور تھیٹر کی ایک دنیا آباد ہے۔ میلے کی رونقوں میں سٹیج کے پرلطف مناظر اور پس سٹیج دردناک واقعات ہیں۔ کباڑ کمپلیکس اور سوانگ پروڈکشنز سرریلسٹک کمپنیاں ہیں۔مرزا اطہر بیگ نے ناول کے واقعات حسن رضا ظہیرنام کے کردار کے ذریعے پیش کیے ہیں۔مصنف نے حسن رضا ظہیرکی نفسیات کا مکمل تجزیہ پیش کیاہے۔ اقبال خورشید 'حسن کی صورتِ حال' پر کچھ یوں روشنی ڈالتے ہیں:

''یہ ناول مرزا اطہر بیگ کے دیگر ناولوں سے مختلف ہے مماثلت بس ایک؛ کلیہ شکنی کی خواہش جو اور شدید ہوگئی ہے۔ ناول میں کئی کردار ایک جیسے ناموں کے حامل ہیں۔ یہ یکسانیت انتشار کو مہمیز کرتی ہے۔ آپ کو سرریئلزم کی جھلکیاں ملیں گی، کچھ عجیب و غریب ادارتی نوٹ۔ مصنف کی براہِ راست کلام کرنے کی عادت اور سب سے اہم؛ بیانیے میں فلم میکنگ کی تکنیک، جس نے ناول کو نئی جہت عطا کر دی ہے۔ دراصل اندرون ناول ایک فلم بن رہی ہے جو'یہ فلم نہیں بن سکتی' اور'یہ فلم ضرور بنے گی' کے درمیان جھولتی ہے لطف دیتی ہے۔'' ۳۳؎

حسن کی صورت ِ حال ہمیں ایک عجیب وغریب دنیا سے متعارف کرواتا ہے۔اس ناول میں تہذیبی خردافروزی، سائنس کے ذریعے دنیا پرغلبہ کے نظریات، سیاسی اتار چڑھائو، ورلڈ ریکارڈ بنانے کی تگ و دو، فلمی سکرپٹ رائٹنگ کا انداز اور ہم نام کرداروں کی تکرار ناول کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔اس

Scanned with CamScanner

ناول میں مرزا اطہر بیگ نے سکرین پلے کی تکنیک استعمال کی ہے۔ناول کا اسلوب، ہیت اور تکنیک نئے تجربات کے حامل ہیں۔

"حسن کی صورت حال" کا بڑا حصہ حسن رضا ظہیر نامی کردار کی دلچسپ نفسیات اور حیران کن صورت حال سے متعلق ہے۔ ناول کے دیگر کردار اور واقعات حسن کی اچٹتی منظر بینی سے سامنے آتے ہیں۔ناول کا ضمنی عنوان " خالی۔۔ جگہیں۔۔ پر۔۔ کرو" ہے۔یہ اندازقاری کے ذہن میں کئی سوالات پیدا کرتا ہے۔ حسن مسلسل سفر کی حالت میں ہوتا ہے جس میں نظر آنے والے واقعات کا کوئی باقاعدہ آغاز و اختتام نہیں ہوتا، بلکہ وہ کئی فلموں کے ٹکڑوں کی مانند یا ان کے ٹریلر ہوتے ہیں۔مصنف کے مطابق قاری نے ان خالی جگہونکو پر کرنا ہے یا ویسے ہی چھوڑ دینا ہے یہ اس پر منحصر ہے۔

حسن رضا ظہیر ناول کا اہم کردار ہے لیکن ہیرو نہیں ہے۔ ہمیں یہ ناول ہیرو کے بغیر آتا ہے۔دیگر کرداروں میں پروفیسر صفدر سلطان تہذیبی خردافروزی کا علمبردارہے۔ وہ اپنی تہذیب کو مغربی خردافروزی سے جلا بخش کر عقلیت اور تجربیت کی توانائی سے پروان چڑھانا چاہتا ہے۔سیٹھ صفدر سلطان ایک عیاش کردار ہے۔سعید کمال ایک فلم ڈائریکٹر ہے، غریب باڈی بلڈر ہے اور صفدر سلطان کا شاگرد بھی۔یہ تینوں الگ الگ کردار ہیں۔ارشاد کباڑیا بھی ایک دلچسپ کردار ہے جس میں شیکسپیئر کی روح آجاتی ہے۔ارشاد کباڑیے کا کتا ہوپ بھی ناول کی ایک دلچسپ تصویر ہے۔ارشاد کباڑیے کا پارٹنر جبار بھی بہت عجیب و غریب کردارہے جس کو عجیب و غریب چیزیں اکٹھی کر کے عالمی ریکارڈ بنانے کا خبط ہے۔نسوانی کردار کے بغیر ناول نامکمل ہی ہوتا ہے اس لیے اس ناول میں انیلا بلال کا کردار ہے جس کا کام فلم پر پیسہ لگانے والے سیٹھ صفدر سلطان کو رجھائے رکھنااور سکرپٹ تحریرکرنا ہیں۔سکرپٹ لکھنے میں سیفی بھی شامل ہوتا ہے۔ماسٹر یٰسین اور حکمت بہزاد بھی اپنی اہمیت کے کردار ہیں۔بالی اور ببلی کے کردار معاشرے کی زیرِ زمین دنیا کے کردار ہیں۔ناول کے دیگر کرداروں میں لکی سٹار تھیٹر کے اداکار اور اداکارائیں ہیں جن میں گلزار پیارا، بے بی کٹار، انیلا سسی، ماسٹر یاسین، فیروز گویا، جانی ہیجڑہ، پروین بیگم عرف پینو دلاری، جہاں آرا سوہنی، فرخندہ ہیر، باورچی دلدار، مہینوال مہتاب، رانجھا سعید کمال، نازلی، بوڑھا ہدایت کار اور گُرو میر مرجان اور ان کا مالک شمشاد ایرانی ہے۔

مرزا اطہر بیگ نے ان تینوں ناولوں مینمروجہ اسلوب اور تکنیک کی پیروی نہیں کی بلکہ نئے اسلوب اور تکنیک کو متعارف کروایاہے۔ اسلوب، تکنیک اور ہیت کے ان نئے تجربات ان کے تینوں ناولوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے ناولوں سے ان کے تبحر علمی کابخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔مرزا اطہر بیگ کے ناول غلام باغ، صفر سے ایک تک اور حسن کی صورت حال جدیداردو ناول کی روایت میں ایک عمدہ اضافہ ہیں۔ان ناولوں نے اردو ناول کی نشاۃ ثانیہ میں اپنا بھر پور کردار اد کیا ہے۔

حوالہ جات:

)۱(　خالدہ حسین، کاغذی گھاٹ، لاہور: سنگِ میل پبل کیشنز، ص۲۵

)۲(　ایضاً، ص۷

Scanned with CamScanner

(۳) ایضاً، ص۳۸

(۴) ایضاً، ص۶

(۵) ایضاً، ص۴

(۶) ایضاً، ص۲۲۴

(۷) ایضاً، ص۳۵

(۸) ایضاً، ص۲۶

(۹) ایضاً، ص۵۰

(۱۰) ایضاً، ص۱۸

(۱۱) ایضاً، ص۷۴

(12) http://www.bbc.com/urdu/miscellaneous/story/2007/01/070104_ghulam_tahir_rs.shtml.

(۱۳) سہیل احمد خان، ڈاکٹر، "فلیپ"، غلام باغ، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، اشاعت چہارم، ۲۰۱۳ء

(۱۴) محمد حمید شاہد، مٹی آدم کھاتی ہے، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۷، ص ۱۵

(۱۵) ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سرو کار، لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۳

(۱۶) حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۸ء، ص۲۵۰

(۱۷) روبینہ سلطان، "دھنی بخش کے بیٹے"، مشمولہ کہانی گھر، لاہور، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۱۸۷

(۱۸) حسن منظر، دھنی بخش کے بیٹے، ص۲۴۲

(۱۹) روبینہ سلطان، تین نئے ناول نگار، ص ۱۰۶

(۲۰) غفور احمد، نئی صدی-نئے ناول، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۴ء، ص۲۷۴، ۲۷۵

(۲۱) عبید اللہ بیگ، راجپوت، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۲ء، ص ۳۷

(۲۲) ایضاً، ص ۷۷

(۲۳) ایضاً، ص ۸۰

(۲۴) ایضاً، ص ۱۳۸

(۲۵) رئیس فاطمہ، روزنامہ ایکسپریس، ۱۹ اگست ۲۰۱۰ء

(۲۶) غفور احمد، نئی صدی -نئے ناول، ص۲۹۶

(۲۷) اطہر بیگ، مرزا، صفر سے ایک تک، لاہور:سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص۱۰

(28) http://jang.com.pk/the news/sep 2010-weekly/nos-12-09-2010/lit.html

Scanned with CamScanner

)۲۹(	ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر، اردو ناول کے چند اہم زاویے، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۶ء، ص۸۱
)۳۰(	شمس الرحمٰن فاروقی، قبضِ زماں، دہلی : عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۴
)۳۱(	انتظار حسین، روزنامہ ڈان، ۲۹ ستمبر ۲۰۱۴ء
)۳۲(	محمد سلمان بھٹی، ڈاکٹر، حسن رضا، ادراک، مانسہرہ: شعبہ اردو، ہزارہ یونیورسٹی، شمارہ ۴، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۵ء، ص۴۶
)۳۳(	اقبال خورشید، ''مرزا اطہر بیگ کی صورت حال''، مشمولہ سنڈے ایکسپریس، فیصل آباد: ۲ نومبر۲۰۱۴، ص۲۱

/....../

Scanned with CamScanner